

آسیہ زرقی

سُخمری ہر

خالہ بی اس وقت ہاتھ روم میں تھیں۔ اور دروازے پر دستک کسی بے قرار روح کا اشارہ کر رہی تھی۔ گھنٹی بھی ساتھ ساتھ میوزک کا کام دے رہی تھی۔ ویسے تو گھنٹی کی آواز ہاتھ روم میں بھی سنی جاسکتی تھی آسانی سے۔ لیکن۔ اگر خاموشی ہو تو خالہ بی جب کسی سے گفتگو کر رہی ہوں تو باہر کی آواز سننے سے قاصر اور دروازے پر درجہ مجبوری۔ اسی کو کھولنا پڑا۔ یہ بھی خیال کہ دستک دینے والا نہ جانے کتنا

زندگی۔ اندازہ ہی نہ تھا اتنی مشکل ہوگی۔ ہر لمحہ امتحان سے سابقہ ہوگا۔ اور پتا چلتا ہی نہیں کہ اس کا رزلٹ کب آئے گا۔ انتظار بھی حوصلہ شکن ہے۔ رزلٹ کے انتظار میں کہیں سارے جذبے ہی نہ سو جائیں۔ کم سنی میں ہی اتنے تجربات ہوئے۔ یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے اور اگر یہ بھی امتحان ہے۔ تو اس کا رزلٹ۔ کیسا ہوگا؟ یا پھر۔ سب بے نتیجہ۔

مُکھل تاول

Downloaded From
Paksociety.com

READING
Section

ضروری پیغام لایا ہو۔ پھر خالہ بی کی ڈانٹ اسے ہی سنی پڑے گی۔ دروازے پر شناسا صورت نظر آئی۔
 ”اوہیلو۔ آہ۔ تم؟ کیسے؟ آجاؤں؟“ مختصر سوال۔
 ”ہاں۔ آجاؤ۔“ بدرجہ مجبوری اجازت دی ورنہ خالہ بی کی ڈانٹ کون سنتا کہ گھر آئے مہمان کو بھگا دیا۔ برکت سے منہ موڑ لیا۔ رحمت کو دھتکار دیا۔
 ”تمہارے ہاں سلام کا رواج نہیں؟“ تسخراڑا رہا تھا۔ اس کی شکل کا جو بارہ بج رہی تھی۔ وہ بھی رات کے بارہ۔

”سلام۔ اب خوش؟“ وہ کب خوش تھی۔
 (ارے لڑکے کو بلا کر بٹھا لیا۔ اکیلا لڑکا۔ شرم و حیا تو گھول کر پی لی۔ میں آجاتی۔ کھول دیتی دروازہ اور اگر کوئی ڈاکو ہوتا۔ صبر نہیں ہے آج کل کی لڑکیوں میں۔ ارشادات خالی لی)

”تمہارے گھر میں خاطر تواضع کا بھی دستور نہیں ہے۔ اتنی گرمی میں آیا ہوں۔“ اسے یوں ہی استہانہ دیکھ کر حیران ہوا۔

”اچھا۔“ کہہ کر اندر گئی۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس پکڑا یا۔

”یہ۔ آواز کس کی آرہی ہے۔ کوئی مہمان آیا ہوا ہے کیا؟“

”نہیں۔ خالہ بی ہیں۔“
 ”پتا ہے۔ تم اکیلی ہو تیں تو بھلا دروازہ کھولتیں؟ کس سے باتیں کر رہی ہیں؟“

وہ چپ رہی۔ گلاس خالی ہونے کا انتظار تھا۔
 ”بتاؤ نا۔ کون آیا ہوا ہے؟ تمہارے سسرال والے؟ یا بتانا نہیں چاہتیں۔“

وہ ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی گلاس لینے کے لیے۔ ہاتھ گرا کر سامنے کرسی پر ڈٹ گئی۔
 ”ابھی آتی ہیں۔ خود پوچھ لیتا۔“

”تم بتاؤ گی تو قیامت آجائے گی؟“ انگارے چبارہا تھا۔ (ہاں شاید۔ آج بھی سکتی ہے۔ بتاؤں تو کیا سمجھے گا اور خالہ بی کو پھرتائے گا۔)

”تم چاہتے ہو کہ آجائے۔؟“

قیامت نہیں۔ خود خالہ بی آگئیں۔ بولتی باتیں کرتی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا۔

”آئیں؟ اچھا؟ تم کب آئے؟“ وعلیکم السلام۔ کتنی در سے بیٹھے ہو؟“ ترچھی نظر بھانجی پر بھی ڈالی۔ مطلب (نہیں مانا تم نے۔ کھول دیا دروازہ۔ کتنی دفعہ کہا ہے۔ یہ وہ)

”ابھی دو منٹ پہلے۔ گرمی بہت ہے باہر۔ اس لیے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ وہ کھل گیا کھٹ سے۔ آپ کو آواز دی تو تھی۔“ جھوٹ کے طومار باندھ رہا تھا۔

”آ۔ رے۔ ہاں۔ کبھت کی چٹنی ڈھیلی ہو گئی ہے۔ زور زیادہ لگایا ہو گا۔“

”مگر خالہ بی۔ خطرناک بات ہے۔ کوئی بھی زور لگا کر آجائے۔ ٹھیک کروالیں۔“

”میرے پاس کون بیٹھا ہے جو ٹھیک کروانے والے کو بلواؤں اور کس کی مجال ہے کہ میرے دروازے کے پاس آکر بھٹکے بھی۔ جان نہ نکال لوں اس کی۔ ٹیڑھی نظر بھی کسی نے دروازے پر ڈالی۔ سمجھو۔ اپنی

شامت کو آواز دی۔ اچھا خیر۔ تم بتاؤ۔ کیسے آنا ہوا۔ رفیعہ کیسی ہے اور وہ کیا نام تمہاری شیخوپورے والی بہن۔“

”سب ٹھیک ہیں۔ امی نے آپ کی خیریت پوچھنے بھیجا ہے اور یہ۔“ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لمبا سالفافہ نکالا۔

”یہ۔ کیا ہے؟“ ناک چڑھالی۔ ہاتھ نہ بڑھایا۔
 ”یہ۔ مراد بھائی امریکہ سے آئے ہیں۔“

”اے مراد وہی نا۔ تمہارا چچا زاد جو اپنی کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا۔ اس کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ نا مراد امریکہ چلا گیا۔“

”جی! تو ضرار بھائی نے آپ کے لیے خط بھیجا ہے۔ خط اور ڈالر بھی ہیں۔“

خالہ بی تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ”اچھا۔ کیا سمجھا ہے

مجھے میں فقیر ہوں محتاج ہوں جو خیرات لیتی پھوں۔
لے جاؤ لفافہ اور کہنا مراد سے۔ ابھی میں اتنی
محتاج نہیں ہوئی۔ شکر ہے پروردگار کا۔ میرا اللہ میرے
ساتھ ہے۔ میری تمام ضرورتیں حاجتیں وہی پوری
کرتا ہے۔ اسے لے جاؤ۔ لفافے کی طرف اشارہ
کیا۔

”خالہ بی! خط تو پڑھ لیں۔ شاید کوئی ضروری
بات ہے۔“

”خط کیوں پڑھوں؟ جب اس سے کوئی تعلق
نہیں۔ میں تو اس لفافے کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں۔ جابیٹا۔
گھر جا اور اس سوغات کو بھی ساتھ لے جا۔“

”اچھا۔ اچھا۔ جاتا ہوں۔ چھوڑیں لفافے کو۔
گرمی بہت ہے۔ کوئی ٹھنڈا شربت مل سکتا ہے۔“
”ہاں ہاں۔ اے کیوں نہیں۔“ خالہ بی کے چہرے
کے تاثرات یکدم تبدیل ہوئے۔

”اصباح۔ اے یہ نہ ہوا بچے کو شربت ہی پلا دیتی۔
گرمی اس بلا کی ہے۔ انار کا شربت برف ڈال کر لے
آ۔ شاہش۔“ اب ظاہر ہے اٹھنا پڑا۔ کتاب میز پر
رکھی۔ خالی گلاس اٹھایا اور باہر چل دی۔

”آپ ابھی میں آیا تو کسی سے باتیں کر رہی
تھیں۔“ فوہ تجسس۔

”اے۔ ہاں۔ وہ باتھ روم میں ایک کچوا گھس آیا۔
اس کو ہی کہہ رہی تھی کہ بھئی۔ بھاگ جانا لی کے
رستے۔ جدھر سے آیا ہے۔ مگر ڈھیٹ ایسا۔ اے ایسی
اچھل کود مچائی۔“

”اچھا تو پھر کیا کرتا تھا۔ جائے گا کہ نہیں؟
”لو۔ وہ کیا بولے گا۔ میں ہی بول رہی تھی۔ ہرگز
نہیں گیا۔ کونے میں سکڑا پڑا ہے۔ اب میرے
گانگوڑا۔ جب باتھ روم میں کوئی کچوا آجائے۔ سمجھ لو
اس کی موت لے آئی ہے یہاں۔ جسم کے ذرا ذرا سے
ٹکڑے نامراد جدھر سے گزرتا ہے گراتا جاتا ہے۔
بس۔ پھر اگلے دن دیکھو مر پڑا ہے۔“

”بے خالہ بی! آپ کیڑے مکوڑوں پر اتھارٹی

ہیں۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہم دیکھا کرتے تھے۔ آپ
چیونٹوں سے خوب باتیں کیا کرتی تھیں۔ مینڈک بھی
آپ کے آس پاس گھوما کرتے تھے۔“ اعزاز کو بچپن کی
باتیں یاد ہیں؟

”ہٹ شریر۔ برسات میں کیڑے مکوڑوں کا راج
ہوتا ہے اور کچھوے تو برسات میں ہی نکلتے ہیں مگر یہ جو
باتھ روم کی نالی ہے یہاں بارہ مہینے برسات رہتی ہے۔
اس لیے۔“

شریٹ آگیا۔ خوب ٹھنڈا ٹھنڈا۔ لذیذ۔
”اچھا خالہ بی! چلتا ہوں۔ شریا کی شادی پر ضرور
آئے گا۔“

”اچھا۔ کہاں ہو رہی ہے۔ اللہ نصیب والی
کرے۔“

”کارڈ چھپ جائیں تو بھیجیں گی امی! چلتا ہوں
خالہ۔ السلام علیکم۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ خالہ بی غالباً ”کچھوے کی اچھل کود
سے خاصی تھک گئی تھیں۔ بیٹھی رہیں۔ اصباح سے
کہا۔“

”جابیٹا۔ دروازہ اچھی طرح بند کر کے آنا۔“
یعنی۔ اسے دروازے تک جانے کی اجازت۔

بہنوں کے لیے خوشخبری
خواتین ڈائجسٹ کے ناولوں پر

40% رعایت

یہ رعایت صرف ہماری دکان

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی پر دستیاب ہے

دروازے کے پاس پہنچ کر اعزاز نے جیب سے وہی لفافہ برآمد کیا۔

”لو۔ یہ رکھو۔ اس میں خط بھی ہے بڑھ لینا۔ شاید کوئی کام کی خبر ہو۔“ اصباح ہچکچا کر لفافہ پکڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں کیوں پڑھوں۔ اپنی اماں کو لکھا ہو گا۔“

”اچھا تو وہیں کہیں رکھ دیتا۔ بڑھ ہی لیں گی اور تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو؟ حالت دیکھو اپنی۔ سسرال والے دیکھیں گے تو سمجھیں گے۔ خالہ بی فاقے کرائی ہیں۔“

”وہ۔ اصل میں امتحان کی تیاری کے لیے جاگنا پڑتا ہے۔ اس لیے۔“

”بھئی، ہم تو امتحان کے زمانے میں خوب ڈٹ کر کھاتے تھے اور جی بھر کر سوتے تھے۔“

”اچھا!“ حیران ہو گئی۔

”ہاں اور کیا“ جب بھی رات کو پڑھنے بیٹھتا۔ امی دودھ کا گلاس رکھ دیتیں وہ پیا اور وہیں میز پر سر رکھ کر۔ ٹن۔ کیسا جاگنا۔ کہاں کا پڑھتا۔“

وہ غصہ سے تھی کہ وہ باہر جائے تو دروازہ بند کرے، مگر اعزاز ایک باتوںی۔ واپس آئی تو خالہ بی نے سر اٹھا کر کہا۔

”اتنی دیر کیوں لگی۔ باتیں کرنی تھیں تو یہیں کر لیتیں۔ بتاؤ۔ کیا کہہ رہا تھا۔“ تحقیقات ضروری۔ اس نے جھٹ لفافہ سامنے کیا۔ ”یہ۔ یہ دے رہے تھے۔ میں نہیں لے رہی تھی۔“

سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ سرد آہ بھری۔ ”رکھو اپنے پاس۔ صبح بینک میں لا کر میں رکھ آتا۔ ایک نہیں دو ڈالر۔ سو سو کے چھینچ کر لیتا۔“

”یہ۔ خط۔“

”پھاڑ دو۔“ آرڈر۔ اور فوری عمل کرنا لازمی۔ ان کے سامنے اس نے پھاڑ کر ڈسٹ بین میں ڈال دیا۔ لمبا سا کاغذ نہ جانے اس میں کیا کچھ لکھا ہو گا۔ معافی تلافی۔ حال چال یا گزارش۔ خط پھاڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ کتاب سامنے تھی۔ بیٹے سے ٹالاں۔ فون اسی لیے

کٹوا دیا کہ اس کی آواز سننے کی خواہش نہ تھی ایک شخص کی خاطر اتنی اہم ضرورت سے پیچھا چھڑالیا۔ اب صوفے پر آڑی پیڑھی لیٹی چھت گھور رہی تھیں۔ ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔ کوئی بات۔ کوئی یاد۔ پتا نہیں کیسی ماں تھیں اور کیا سوچا کرتی تھیں۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ بولنے پر آئیں تو وقفہ نہ آنے پاتا۔

اعزاز۔ پرانے محلے میں جہاں اصباح کے والد کا گھر تھا۔ پڑوس میں رہتا تھا۔ اعزاز کی امی سے اصباح کی امی مصباح کی قریبی رشتے داری تھی۔ وہ لوگ تو اب بھی اپنے اسی گھر میں رہتے تھے ہاں اصباح اب وہاں نہ تھی۔ وہاں کیا نہ تھی بلکہ کہیں نہ تھی۔

اسے تو لگتا تھا۔ اس کا کوئی گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ سارے ٹھکانے عارضی ہیں اور خالہ بی بھی تو کہتی ہیں دنیا تو عارضی ٹھکانہ ہے اصل ٹھکانے پر پہنچنے اور خود کو اس اعلیٰ مقام کا جائز و وارث ثابت کرنے میں بھی تو اپنا ٹھکانہ ہونا چاہیے۔ یہ تو خالہ بی کی محبت اور اخلاص تھا کہ وہ اسے لے آئی تھیں۔ ورنہ کہاں جاتی۔ اعمال کی درستگی کی کوشش بھی کرتی تھی۔ خالہ بی کی ہدایت کے مطابق۔ جتنا اس کی سمجھ میں آتا تھا۔

لڑکوں سے بالکل بات نہیں کرنی۔ لڑکوں کو نظر انداز کر دینا۔ لڑکوں کا زیادہ بولنا چاہ کر بات کرنا برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ گھر میں بھی خاموش رہتی۔ کہیں جاتی چپ کا روزہ رکھ کر۔ کوئی مہمان آتا اس کے سامنے بت بن جاتی۔ گوشتی کا کردار بہت اچھے طریقے سے ادا کرتی۔ کوئی اعتراض کرے تو خالہ بی اس کے سامنے ڈھال بن جاتیں۔ یہ تو کبھی نہیں جانتیں کہ ان ہی کے فرسودات پر عمل کر کے وہ گوشتی بنی ہے۔ فوراً کہتیں۔

”اے بھئی“ اچھا ہے۔ خاموشی بہت بہتر ہے۔ بندہ گناہوں سے بچا رہتا ہے اور لڑکیوں کو باتیں بنانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ گھر میں بڑے ہیں وہ ہی بولنے کے لیے کافی ہیں۔“

”بڑے کون؟“ خالی بی۔ اکیلی خالہ بی سب کو ہرا

سکتی تھیں۔ چپ رہ کر نہیں۔ بول بول کر اور خالہ بی بھی زبردستی یا مجبوراً "یا ضرورتاً" اس کی ذمہ داری بن گئی تھیں۔ وہ بہت کم کسی سے ملتی تھیں۔ رشتہ داروں سے ملنا جلنا ان کے میاں کو پسند نہ تھا، مگر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ تو جب اصباح پر افتاب۔ ایسی ویسی۔

ابا کے گزرتے ہی وہ اس اذیت رساں زمانے، تکلیف دہ دنوں کو یاد کرنا چاہتی تھی نہ یاد رکھنا۔ خاموشی میں پناہ لے لی تھی اس نے۔ خالہ بی اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ کبھی کبھی خالہ بی کی کوئی نند بھول بھٹک کر ان کے پاس آئیں ان سے ہمدردی کے اظہار میں، لیکن موقع ملتے ہی تنہائی میں اصباح سے سوالات بھی ضرور کرتی تھیں۔

"تم سے برتاؤ کیسا ہے؟ سختی تو نہیں کرتیں؟"

وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھتی۔

"شکر کرو بھی۔ ظالم جلا د عورت ہیں۔"

وہ حیران ہو جاتی۔ "میری خالہ ہیں۔ مجھ سے برا

برتاؤ کیوں کریں گی؟"

ان کی آنکھوں کے زاویے بدل جاتے۔ بھنویں چڑھا کر۔ "نہ پوچھو۔ کب کسی سے بنا کر رکھی ہے انہوں نے۔ میاں کیوں چھوڑ بھاگے۔ جاؤ۔ بیٹا کیوں بدل گیا ہے۔ کوئی وجہ؟ تمہیں تو مجبوری میں رکھا ہوا ہے۔ اکیلی جو رہ گئیں چلو۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ نہ تم اجڑائیں۔ نہ یہ بے بسیں۔"

ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ فکر فکر انہیں دیکھتی رہتی، لیکن یہ پہلے کی بات تھی۔ اب وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔

"ان لوگوں کی نظریں میرے گھر پر ہیں۔" خالہ بی

نے ایک دن بتایا تھا۔

"کیوں؟ اس پر ان کا کیا حق ہے۔ یہ تو نانا کا گھر

ہے۔"

"انہیں اس سے کیا غرض۔ ادھر میں میری ادھر یہ

قبضہ کرنے آئیں۔ بھی تاک میں ہیں۔ حق سے کیا۔

قبضہ کیا۔ ادعوا جھوٹا۔ یہ ہے ان کا مقصد۔"

گھر نانا کا تھا۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث یہ گھر انہوں نے دونوں بیٹیوں کے نام کر دیا، لیکن ہوا یہ کہ خالہ بی کی شوہر سے بنی نہیں۔ وہ عیاش طبع تھے۔ لڑائی ہوتی رہتی۔ ایک بیٹا تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ خالہ بی کو علم ہو گیا۔ شوہر کی دوسری بیوی بھی ہے۔ خالہ بی کا زیور وہ بہانے بہانے سے لے کر ٹھکانے لگا چکے تھے یا اس کلموہی کے حوالے کر چکے تھے۔ اب گھر فروخت کرنے کی بات کرنے لگے تو بات آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد۔ وہ سنا کہ کینڈا اچلے گئے۔ جہاں دوسری بیوی کے بھائی تھے۔ بیوی بھی چلی گئی۔

بیٹا بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ خالہ بی کے حالات خراب ہوتے گئے تو اصباح کے ابا کے مشورے پر مصباح گھر سے دست بردار ہو گئیں۔ پورا گھر خالہ بی کو مل گیا۔ بہت عرصہ ہوا، مگر بے چارے ابا کو کیا علم کہ وہ اپنے گھر سے بھی بے دخل ہونے والے ہیں۔ وہ تو خیر پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی پہلی بیوی کے بیٹوں نے عرصہ دراز سے اپنے حصے کا دعوا کر رکھا تھا۔ باپ سے لڑائی کرتے اور بحث مباحثہ۔ اسی وجہ سے ان کا دل کمزور ہوتا گیا۔ خالہ بی نے اپنی سہولت کے لیے، گھر کے ایک حصے کو کرائے پر چڑھا دیا۔ درمیان میں دیوار بنوا دی۔ کچھ دن کرائے دار نے کرایہ دیا۔ اب نہ گھر خالی کرتے نہ کرایہ دیتے۔ خالہ بی پر اس کا بہت برا اثر ہوا مگر وہ محاذ پر ڈٹی رہیں۔ مقدمے کی نوبت آگئی۔ اصباح کو لگتا۔ ایک اس کے ہی خاندان کو شامتوں نے گھیر رکھا ہے۔

دائیں جانب کے بڑوسی کے بیٹے کو ساتھ لے کر اصباح صبح ہی ڈالر چینیج کروالائی۔ "شاید کو روک لیتی۔ چائے وائے پلا دیتی۔ بے چارہ اتنا کام کر دیتا ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھی کہ وہ شاید ہے، مگر وہ زاہد تھا۔ وہ چائے نہیں پیتا۔ اس نے خود بتایا کہ میں زاہد ہوں۔ پھر میں نے اسے سو روپے دے دیے کہ جا کر بوتل پی لو۔"

"اے ہاں۔ یہ شمنہ کے جڑواں بیٹے۔ کوئی گل ضرور کھلائیں گے۔ دیکھنا پتا ہی نہیں چلتا۔ کون زاہد۔"

کون شاید۔“
 ”خالہ بی۔ شاید کی کنپٹی پر تل ہے۔ شینہ آنٹی اسی سے پہچانتی ہیں۔“
 ”سب کو اس بات کی خبر کہاں ہے۔ ویسے بھی ٹوپی منڈھ لیتا ہے تل چھپانے کے لیے۔“
 ”تل چھپانے کے لیے؟“ اصباح حیرت سے خالہ بی کی تحقیق پر انہیں دیکھنے لگی۔

”ہاں شرارت کر کے زاہد پر تھوپ دیتا ہے۔ خود معصوم بن جاتا ہے۔ زاہد شریف بچہ ہے۔“
 ”تو لوگ ٹوپی سے پہچان نہیں لیتے؟“

”پہچانیں تو تب۔ جب انہیں اس چالاکی کی خبر ہو۔ خیر بھئی۔ اللہ انہیں زندگی اور ہدایت دے۔ بیٹے ہیں مگر آج کل کا زمانہ۔ بیٹوں پر بھروسہ کرنے کا نہیں ہے۔ جسے دیکھو ماں باپ کو شرمندہ کر رہا ہے۔ نالائق۔ ناخلف اولاد۔“ انہیں شاید اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا۔

”خالہ بی۔ پھر لوگ لڑکوں کی دعا کیوں کرتے ہیں۔ ان پر فخر کیوں کرتے ہیں؟“

”پاگل پن اور کیا۔ جانتے نہیں کسے اولاد فتنہ ہوتی ہے۔ اور یہ لڑکے توبہ!!“

”تو لڑکیاں۔ اچھی ہوتی ہیں۔“ خوش ہو گئی۔
 ”ہاں۔ مگر کوئی ان کے لیے دعا نہیں کرتا۔ بس اللہ کی مہربانی سے رحمت برس جاتی ہے۔“



آج کل وہ چپ رہنے لگی تھیں۔ ذریعہ آمدنی کچھ رہا نہیں۔ بیٹے کے پاس سے جو ڈالر کبھی کبھار آتے تھے۔ سخت ضرورت پر ان میں سے ایک دو سو کے نوٹ لے کر سب لا کر کی نذر۔ ڈالروں کو خود ہاتھ نہیں لگاتی تھیں۔ ہاں جب وہ پاکستانی کرنسی کے روپ میں آجاتے۔ تو۔۔۔ مجبوری۔ پھر اللہ کی کرنی ان کے ایک دیور آگئے۔ گو کہ خالہ بی ان سے کھنچی کھنچی سی تھیں، مگر وہ بے حد اخلاق اور محبت سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اصباح کے سر پر ہاتھ پھیرا، نصیحت کی۔
 ”دیکھو بیٹا! اچھا برا وقت سب پر آتا ہے، مگر اللہ کی

طرف سے کبھی مایوس نہ ہونا اور اپنی خالہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ دنیا مطلبی اور خود غرض لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ بھابھی نے تمہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ بھابھی بہت مضبوط اور کھری خاتون ہیں۔ اللہ نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا سارا بننے کا موقع دیا ہے۔ دنیا میں اتنے برے کی پہچان اسی طرح ہوتی ہے۔“

وہ سر ہلاتی رہی۔ کہہ نہ پائی۔ ”آپ کی بہنیں تو کہتی ہیں کہ اپنی تنہائی سے تنگ آکر بھانجی کو بلا کر رکھا۔ اپنے مطلب کے لیے۔ جب گھر اپنے نام کروایا تھا۔ تب نہ بہن یاد آئی نہ بھانجی۔“

انہوں نے پھر اپنے اوپر گزرنے والی واردات سنائی۔ برسوں پہلے سعودی عرب گئے تھے۔ وہاں سے امریکا کو شش کی تو انہیں وہاں کی شہرت مل گئی، بیوی بھی مل گئی۔ مطلب شادی کر لی۔ پھر۔۔۔ ایسا ہوا کہ وہ پیدل کہیں جا رہے تھے تو ایک گاڑی بے قابو ہو کر ان پر چڑھ گئی۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے گاڑی کے بمبر ڈھن نشین کر لیے ذرا صحت مند ہونے کے بعد پولیس کو اہکسمینٹ کی رپورٹ کی۔ بارے انہیں وہاں کے قانون کے مطابق جرمانہ ادا کر دیا گاڑی والے نے جرمانہ اتنا تھا کہ وہ اسے تائید غیبی سمجھ کر واپس پاکستان آگئے۔ گو کہ اس میں بھی چند وجوہات۔ یا رکائوں کی وجہ سے کئی سال لگے۔

یہاں آکر وہ ایک ٹرسٹ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب سعودی عرب گئے تھے تو بھائی کینیڈا جا رہے تھے بعد میں نتیجے کی روانگی کی خبر سے از حد افسوس ہوا۔

سعودی عرب جانے کے لیے ایجنٹ کو دینے والی رقم انہوں نے بھائی سے قرض مانگی تھی۔ انہوں نے بھابھی کے زیور ہتھیا کر فروخت کیے اور چھوٹے بھائی کو ممنون احسان کر دیا۔ وہ قرض انہیں ادا کرنے کا اب خیال آیا۔ بھابھی کی حالت پر افسوس ہوا۔ وہ ان کے حالات سے بے خبر تھے۔ اہکسمینٹ۔ اس سے ملنے والی رقم۔ شاید اللہ نے انہیں اس قرض کی ادائیگی اس

طرح کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ٹرسٹ سے ہونے والی آمدنی بھی وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے اور اب قرض بھی اسی طرح ادا ہو گا۔ بھابھی کی عنایتوں کا قرض۔

خالہ بی پہلے تو سختی سے انکار کرتی رہیں، مگر انہوں نے اس قدر دلیلیں دیں کہ مجبور ہو گئیں۔ ان کے ان دنوں کے زیورات۔ کی قیمت اب دس گنا سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

”میں آپ کی محبت، خلوص کی قیمت تو ادا نہیں کر سکتا۔ جو آپ نے میرے ساتھ سلوک کیا وہ کوئی بہن نہیں کر سکتی، لیکن شاید آپ کی تکلیفوں کا تھوڑا سا ازالہ ہو جائے۔“

انہوں نے کرائے دار سے بات کرنے اور مقدمے سے نیٹے کا بھی وعدہ کیا۔ بھتیجے کو سمجھانے اور واپس آنے کی تلقین کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ دراصل پہلے وہ خالہ بی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

ان صاحب کی باتوں سے خالہ بی کو تو جو بھی یاد آیا، مگر اصباح کو اپنی افتاد یاد آگئی۔ اس کے زخموں کے کھرنڈ پھل گئے اور خون رسنے لگا۔ جب وہ سراسیمہ ہو اس باختم اکیلی تن تنہا گھر کے لان میں کھڑی اپنا گھر لگتا دیکھ رہی تھی۔ پولیس۔ عدالت کے لوگ۔ کمروں میں گھس کر سامان نکال رہے تھے۔ تب ایک لیڈی پولیس انسپکٹر نے اس کا بازو ہلایا۔

”تم اپنا سامان لے سکتی ہو۔ باقی سامان نیلام ہو گا۔ یہ گھر اب فروخت کر دیا گیا ہے۔“

اس کے اوپر جو پہاڑ اُگرا تھا۔ اس کے بوجھ سے وہ گرنے لگی۔ پڑوس میں رہنے والی رفیعہ خالہ ہی گھبرائی ہوئی آئی تھیں۔ انہوں نے ہی عدالت کے ہیلف سے مذاکرات کئے۔ سر تھام کر اس کے پاس آئیں۔

”بچی! یہ گھر تو کیا تمہارے بھائیوں نے پورا گھر اپنے نام کر لیا ہے اور اب اس پر تمہارا یا مصباح کا حق نہیں۔ ستم ہے۔ ایسا ظلم خون سفید ہو گئے۔“

انہوں نے خود اس کے کمرے سے الماری سے ان کا سامان نکالا۔ کپڑے، جوتے، کتابیں، کھلونے،

چادر میں باندھ کر رکھ دیا۔ وہ تو برف کی مانند جمی کھڑی تھی۔ منجمد چٹان۔ وہ ظالموں کو کوستی بھی جارہی تھیں۔ جن کی وجہ سے مصباح اسپتال پہنچ گئی اور بچی بے سائبان۔

جب افراز اور اعزاز اس کا سامان اٹھا کر لے گئے۔ تب بھی وہ وہیں کھڑی رہی۔ رفیعہ خالہ پولیس والوں سے لڑ رہی تھیں۔ سوتیلے بیٹوں نے ماں بیٹی کو بے سارا کر دیا۔ ماں تو گھر کے بننے کی خبر سن کر ہی اسپتال جا پہنچی اور یہ بچی۔ ارے اسی کا خیال کر لیتے باپ تو ایک ہی تھا۔ دیکھنا۔ دنیا میں ہی انہیں کیسی سزا ملے گی۔ اللہ کو ایسا ظلم پسند نہیں۔ یتیم بچی کا سر چھپانے کا ٹھکانہ چھین لیا۔ اُدھے گھر کی حصہ دار ہیں ماں بیٹی۔ اور تم لوگوں کو بھی اس ظلم کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تم بھی شریک ہو۔“

وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کی ڈیوٹی تھی۔ مصباح کے کمرے سے بھی کچھ اٹھانے نہیں دیا۔ تصویریں البتہ انہوں نے دے دیں۔ مہربانی۔

”یہ کیسا قانون ہے بھئی۔ اس بچی کی ماں اسپتال سے آکر کیا کپڑے نہیں پہنے گی۔ تمہارے کس کام کے ہیں یہ۔“ بمشکل حجت کر کے انہوں نے الماری سے کپڑے نکالے۔

قانون اندھا ہی نہیں۔ گونگا بھی ہے۔ بہرا بھی۔ ظالم تو ہے ہی۔ دیوانہ وہ رفیعہ خالہ کے گھر رہی۔ عجیب مدہوشی کی بے یقینی کی سی کیفیت رہی۔

رفیعہ خالہ صبح شام اسپتال جاتی تھیں۔ افراز وہیں روتا تھا پھر نہ جانے کس نے مصباح کو گھر کے بارے میں خبر پہنچائی۔ افراز تو برابر سب ٹھیک ہے کی خبر انہیں دے رہا تھا اور پھر۔ ایسوی لینس پر وہ رفیعہ خالہ کے گھر ہی آگئیں۔ اصباح تو ہوش بنی۔ برآمدے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ رفیعہ خالہ نہ جانے کس انتظام میں لگی ہوئی تھیں۔ ثریا بھی مصروف۔ دریاں چاندنیاں گریاں۔ افراز پانی بھر کر بڑے پیلے میں لے جا رہا تھا۔ اعزاز فون کیے جا رہا تھا۔ پھر ایسوی لینس آئی۔ ساتھ ہی خالہ بی۔ آتے ہی اصباح کو لپٹا کر بیٹھ گئیں۔

یکایک صحن۔ عورتوں سے بھر گیا۔ رشتے دار۔
 بڑی۔ سعیدہ مولانی سیدھی ادھر آئیں۔ اصباح کو لپٹا
 گرہ پار کرنے اور خالہ بی سے سوالات کرنے لگیں۔ وہ
 بدحواسی کے عالم میں صحن میں ہوتی کارروائی دیکھ رہی
 تھی۔

”بھئی۔ مجھے تو خبر نہ تھی۔ رفیعہ نے فون کیا میں
 اسپتال چلی گئی اور پھر۔ لے آئی اسے۔ رفیعہ آتی ہے
 تو اس سے پوچھتا۔“ خالہ بی سب کو یہی جواب دے
 رہی تھیں۔

محله والیاں صبر کی تلقین کر کے اسے گلے لگاتیں۔
 ہاں جب صحن میں ایک پلنگ لا کر رکھا گیا اور اس پر
 سفید لباس، سفید چادر نظر آئی۔ اس کے دل کو کچھ
 ہوا۔ چھلانگ لگا کر پلنگ کے پاس پہنچی۔ ہاں۔ اس کی
 پیاری یاں۔ سفید چہرے۔ بند آنکھوں کے ساتھ۔
 سوچکی تھیں۔

صبح اس نے رفیعہ خالہ سے کہا تھا۔ وہ اسپتال جائے
 گی، مگر نہ جانے کیوں۔ کسی نے اس کی بات نہیں
 مانی افراز بھائی سے کہا انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ
 پھیرا اور چلے گئے۔ اب۔ وہ حیران کھڑی تھی۔ دائیں
 بائیں خالہ بی اور رفیعہ خالہ۔ اس نے کسی کی سسکیوں
 کی آواز سنی۔ منہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا پھر رفیعہ خالہ
 سے کہا۔

”کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے آنسو بھری آنکھیں
 آنچل سے رگڑ لیں۔

”تل لوماں سے آخری بار۔“ کہہ کر خود ہی بلکنے
 لگیں۔ خالہ بی نے اسے زور سے لپٹا لیا۔ پھر۔ کوئی
 عورت بلبلائی۔

”ارے ختم ہو گئی مصباح۔ ہائے ظالموں نے جان
 لے لی۔“

وہ لڑکھڑا کر گری مگر۔ پھر۔ ایک دم بہت سے مرد
 آگئے اور وہ پلنگ اٹھا کر لے گئے۔

وہ چیخی۔ ”کہاں لے جا رہے ہیں امی کو۔ آپ ابھی
 تو آئی تھیں اسپتال سے۔ پلیز مجھے بات تو کرنے
 دیں۔“ مگر اس کی آواز کلمہ شہادت کی صدا کے

درمیان کھو گئی۔ وہ سب جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ لمحہ
 بھر میں پلنگ غائب اور جگہ خالی۔ وہ اس کے بعد گونگی
 ہو گئی۔ سعیدہ مولانی ان کی بیٹیاں اسے پیار کرتی
 رہیں۔

اور پھر۔ خالہ بی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے
 آئیں۔ اس گھر میں جو نانا کا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں
 حفصہ اور مصباح کو دے دیا تھا۔
 کئی دن سب آتے رہے۔ رفیعہ خالہ ”ان کی بیٹیاں“
 بیٹے، پھر سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا۔



وقت گزر رہا تھا وہ اسکول سے کالج پہنچ گئی۔ خالہ بی
 امت والی تھیں۔ اکیلی رہ گئی تھیں۔ گھر کے دو حصے
 کر کے کرائے پر اسی لیے دیے تھے کہ آمدنی قائم
 ہو جائے۔ اور۔

”کم بخت مسٹنڈوں کی وجہ سے مجھے تسلی رہے کہ
 گھر میں مرد موجود ہیں۔ میں اکیلی نہیں۔“
 درمیان میں جو دیوار بنوائی تھی اس میں کھڑکی لگوائی
 تھی کہ ادھر سے ادھر آنے جانے میں آسانی رہے، مگر
 وہ تو کب سے بند پڑی تھی۔ خالہ بی نے سب جگہ
 کرائے داروں کو خوب بدنام کیا تھا۔ وہ لوگ صفائی
 دیتے رہتے۔

”اجی ہمارے حالات ذرا خراب ہو گئے تھے تو ہم
 نے کہا جوں ہی کچھ معاملات درست ہوئے۔ آپ کا
 کرایہ باقاعدگی سے دیں گے۔ بس ہمارا بھروسہ
 کر لیں۔ اور کچھ دن انتظار، مگر انہوں نے ہماری بجلی
 کٹوا دی۔ تل کٹوا دیے۔ پانی بند کر دیا تو ہمیں بھی ضد
 ہو گئی۔ اور سے سب جگہ ہمیں بدنام کرتی ہیں۔“

اب اصل معاملہ کیا تھا۔ یہ ظاہر نہ ہوا۔ خالہ بی
 سے کسی نے پوچھا کہ کیا حالات خراب ہوئے۔ تو بگڑ
 گئیں۔

”بھئی ان ہی سے پوچھو۔ کرائے دار منحوس ٹرک
 تلے آگیا ہوگا۔ بیٹا چوری کرتے جیل جا پہنچا۔ اللہ
 معاف کرے۔ مجھے کچھ خبر نہیں، مگر ہوا یہی ہوگا۔

نہیں تو جوان بیٹے کے ہوتے کیا حالات خراب ہوں گے اور کیا پتا۔ خیر اللہ معافی۔“

اپنے بیٹے کا بھی خیال آتا ہو گا۔ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ان کے بھی تو حالات خراب ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھار ڈالر بھیجتا۔ تو۔ ”میں تو ہاتھ بھی نہ لگاؤں منحوس کے روئے کو۔“ مگر پاکستانی نوٹ کی صورت میں آتے ہی قبضہ کر لیتیں۔ انہیں اپنے دیور کی طرف سے بہر حال معقول رقم مل جایا کرتی تھی۔

آج کل وہ اصباح کی طرف سے پریشان تھیں۔ اس کا کالج میں آخری سال تھا۔ اب اسے سسرال جانا چاہیے۔ کب تک کرس انتظار۔ ہتھیلی کا چھالا بنا کر بالاب دنیا کی ہر برائی سے گرد و غبار سے بچا کر۔ ہر طرح کی تمیز، سلیقہ سکھا دیا۔ سارے خاندان کو معلوم تھا وہ ایک اچھے کالج میں پڑھ رہی ہے۔ جاہل نہیں ہے۔ اللہ نے حسن بھی دیا ہے۔ گو کہ وہ اپنی اس اضافی خوبی سے لاعلم ہی تھی۔

خالہ تھالی میں وال ڈالے انگلی سے ادھر ادھر ٹٹلا رہی تھیں۔

”لگتا ہے سعیدہ تو جیسے۔“ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ اصباح کا رواں بے تاب تھا۔ انگلی بات سننے کے لیے۔

”خیر بھئی۔ اب۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔“ پھر چپ۔

”کیا ہوا خالہ بی؟“ وہ ڈر گئی۔

”ہوا تو نہیں مگر ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سعیدہ کا کہہ رہی تھی۔ کچھ بدل گئی ہے۔ پہلے جیسی نہیں رہی۔ دو برس سے تو ادھر آئی بھی نہیں۔ ہاں بھئی! اب غریب رشتے داروں سے ملنے میں ہتک محسوس ہوتی ہے۔ سنا ہے گھر میں روپے کی ریل پیل ہو گئی ہے۔ بھائی کی نوکری بھی اور بیٹے جو کما کر گھر بھر رہے ہیں۔“

”خالہ بی! آپ کب ملی تھیں ان سے؟“

”آج۔ تمہارے کالج جانے کے بعد زردی کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے بیٹے کی خیریت کو۔ ٹائیفائیڈ ہو گیا

ہے بے چارے بچے کو۔ وہاں وہ بھی آئی بیٹھی تھی۔ زردی کی اماں سے۔ سچی ہانک رہی تھی۔ دولت۔ شان۔ نیا گھر بھی خرید لیا ہے۔ مجھے وہیں جا کر بتا چلا۔ میں نے سلام کیا تو دو انگلی ماسھے پر لگا کر گردن ہلا دی من بھر کی۔ زبان نہ ہلائی۔ کیوں کہ زبان تو کوالے گیا تھا۔ سچی خوری۔“ تھالی اٹھا کر چلی گئیں۔

”آپ سے۔ بات نہیں کی؟“ اس نے کچن میں جھانک کر پوچھا۔

”یہی بتا رہی ہوں۔ یوں ظاہر کیا جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں۔ بات کرنا تو درکنار۔“

وہ گم قسم ہو گئی۔ سعیدہ مومانی۔ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ خالہ بی بھی دم سادھ کر بیٹھ گئیں، مگر دل میں ان کے خلاف مواد جمع ہو چکا تھا۔

”یہ سعیدہ جو ہے۔ مجھ سے چھوٹی ہے۔ آیا کہتی تھی۔ بھائی واجد مجھ سے بڑے ہیں۔ ان کی بیگم کیا بنی کہ خود کو بہت بڑا سمجھنے لگی۔ واہ۔ چلو جی ہم نے بھی برامان لیا، لیکن اس کا یہ تو مطلب نہ ہوا کہ چھوٹوں کو ادنیٰ سمجھنے لگو۔ بھئی۔ اب تمہارے پاس چار پیسے کیا آگئے کہ ریل پٹری سے اتر گئی۔ واہ بھئی واہ۔ خیر۔ تم دیکھنا۔ میں بھی ایسا بدلہ لوں گی کہ عقل ٹھکانے آجائے۔“

”بدلہ۔“ اصباح ہکا بکارہ گئی۔ ”کس کا بدلہ؟ کیا بدلہ؟ کیسے اور کیوں لیں گی؟ صرف بات نہ کرنے کا۔ یہ جرم اتنا بڑا تو نہیں۔ اب پتا نہیں وہ کیوں ایسی ہو گئیں۔ خالہ بی کی کوئی بات ضرور بری لگ گئی ہوگی۔ ورنہ ایسی ہیں تو نہیں۔ دل بے چین ہو گیا۔



صبح ہی صبح ناجیہ آئی۔ شینہ آنٹی کی بیٹی۔ زاہد شاہد کی بہن۔ ہونق چہرہ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی۔ حواس باختہ۔

”خالہ جی۔ خالہ جی۔ پتا ہے کیا۔ صبح نماز کے ٹائم۔ ابھی ابا اور دادا مسجد گئے تھے کہ امریکا سے بڑے بھائی آگئے۔ اور پتا ہے کیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم۔

گوری یی جھک۔ سفید ایک دم۔ مٹی کے بھٹے جیسے بال۔ ہاتھ جیسے روئی گلابی یی۔
 ”اری اوداستان کو! یہ بتا۔ شینہ نے لگائے دو تھپڑ بیٹے کو کہ نہیں۔“ خالہ بی نے اس کی روانی میں خلل اندازی کی۔ وہ سر ہلا کر پھر شروع ہو گئی۔

”ناجی نا۔ خالہ جی! امی تو ایک دم خوش بہ خوش۔ بے حال۔ ایک تو مفت میں بسو آگئی۔ نہ زیور بنانا پڑا نہ کپڑے۔ نہ بارات کا ٹٹا۔ پیسہ لگانہ کوڑی۔ اور بسو بھی جیسے قازقستان کی پری۔ یہاں تو چراغ لے کر ڈھونڈیں تب بھی نہ ملے۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا کہ اسے گود میں اٹھا کر ناپیں۔ سچی۔“

”کوہ قاف کی پری کہ قازقستان کی۔“ اصباح نے اس کی اصلاح کی۔

”ہاں۔ وہی وہی۔“ گردن ہلائی۔ ”کل سب کی دعوت ہے گھر پر۔ ولیمہ تو بعد میں ہوٹل میں کریں گے۔ بھائی نے بہت سارے نوٹ دیے ہیں امی کو اور ایک ڈائمنڈ کا چم چم کر تاسیٹ۔ ایا کی جیکٹ۔ موبائل اور دادا کا۔“

”اری برساتی نالے کی طرح بے جا رہی ہے۔ یہ تو بتا، تجھے کیا دیا۔“

خالہ بی کا حملہ اچانک ہوا تھا۔ اس کا منہ فٹ ہو گیا۔ ہونٹ سیٹھ لیے بچے کی طرح۔

”خاک دھول مٹی۔ مجھے؟ ہاں۔ بس ایک سوکانوٹ باجی کو بھی وہی۔ شاہد زاہد کو ٹھینکا۔“

”وہ سوکانوٹ نہیں۔ ہزاروں کانوٹ ہے پگلی۔“

”اچھا! میں نے تو سمجھا۔ اوہ۔ امی نے کہا۔ جب گورے گورے بھتیجے بھتیجیاں گود میں کھلائے گی۔ تو سمجھو۔ دولت مل گئی۔ کسی کی بسو اتنی گوری نہیں ہے۔ اور انگریزی ایسی فر فر۔“

”چل بھاگ۔ بی بی سی کی رپورٹر۔“ خالہ بی نے اسے بھگا دیا۔

شینہ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ سب سے قریب ان کا گھر تھا۔ اور خالہ بی کہتی تھیں۔ شینہ میرے ہر موقع پر موجود ہوتی ہے۔ یوں بھی رشتے دار

بعد میں آتے ہیں۔ پڑوسی ہی وقت پر کام آتے ہیں۔ پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے۔ ناجیہ کے جانے کے بعد ایک سرد آہ بھری۔
 ”اچھا۔ دیکھتے ہیں۔ کیسی گوری بسو ہے۔“ شاید بیٹا یاد آ گیا۔

شینہ کا صحن آرائشی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ساتھ ہی شینہ کی بسو بھی مشرقی لباس میں چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ کھڑے ہو کر سب کا استقبال اور ”السلام علیکم“ بہت ہی عربی لہجہ کے ساتھ۔

”مسلمان ہو؟“ خالہ بی بھلا کیسے چپ رہتیں۔ اصباح سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”او! یس۔ الحمد للہ۔“ گوری بسو نے جھک کر کہا۔ خالہ بی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

”یہیں رہو گی یا واپس امریکا جاؤ گی؟“ تحقیقات۔
 ”میں۔ ادھر۔ ہی رہوں گی۔“ بہت خوش تھی۔ اورو؟ واہ بھئی۔ سب نے اس گوری یی۔

بسو کی تعریف کی۔ کھانے کے بعد ایک گانے والی آگئی۔

”میو آتی زبان کا گانا ہے جی۔ غور سے سننا۔“ اس گانے گھر کے لینگے والی نے تاکید کی۔ ڈفلی بجا کر سماں پیدا کیا پھر اونچی پاٹ دار آواز میں گانا شروع کیا۔ لڑکی ماں سے پوچھتی ہے۔

”ماں بھیا کہاں بیا ہو۔ جابو کنا۔“

ماں کہتی ہے۔ ”بیٹی بیا ہولندن سر۔ جابو کنا۔“

”ماں بھیا بھو کیسی آئی۔ جابو کنا۔“ بیٹی آئی گھر کی شوہا۔ جابو کنا۔“

”بیٹی ناک چناسی۔ منہ بڑا سا۔ نوچک چوندر رہبلا میں بھر لائی۔ جابو کنا۔“

قمقمے لگے خوب۔ تشریح یہ تھی کہ ”نوچک چوندر“ یعنی چھچھوندر۔ یعنی کہ اولادیں۔

”بیٹی آئی گھر کی شوہا۔ جابو کنا۔“ اب یہ جابو کنا کیا تھا اس کی تشریح نہ ہوئی، مگر بسو کی تعریف پر جہاں مہمان بنس رہے تھے گوری بھی تالیاں بجا کر داد دے



شروع میں جب خالہ بی اصباح کو اپنے ساتھ لائی تھیں۔ انہوں نے اسے برقعہ پہنایا۔ پھر اسے الجھن ہوئی تو چادر پر اکتفا کیا۔ ہدایات ساتھ میں۔ سر ڈھانکے رہنا۔ ادھر ادھر راستے میں بالکل نہیں دیکھنا۔ اور گلی میں ہنستے کسی سے بات کرنے پر تو سخت پابندی۔

جب وہ کالج گئی تو دیکھا۔ ٹینسہ آنٹی کی بیٹی بھی اسی کالج میں پڑھتی ہے۔ خالہ بی کو بہت اطمینان ہو گیا۔ کالج کے کیٹ سے ذرا آگے بس مل جاتی تھی۔ دونوں ساتھ آجاتیں۔ مین روڈ پر، گلی کے سامنے بس اسٹاپ تھا۔ ایک دو دکانیں بھی۔ آٹھ کے داوا ایک دکان پر بیٹھے ہوتے۔ دونوں کو بس سے اترنا دیکھ کر خود بھی ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑتے۔ ایک لاشی ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ اسے زمین پر مارتے۔ ٹھک ٹھک۔ گویا ان کے چوکیدار ہوں۔ گھر کے دروازے پر رک جاتے۔ جب خالہ بی دروازہ کھولتیں۔ وہ اندر جاتی۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں گھومتے۔

خالہ بی نے ایک دن ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تو بولے۔

”بہن! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ زحمت۔

فائدہ بہت ہوا۔ گھر میں پلنگ توڑا کرتا تھا پڑے پڑے

اب گھر سے لکٹا ہوں۔ دکان تک آتے آتے میری

چلائی ہو جاتی ہے۔ دکان پر بیٹھتا ہوں سانس تیز چلتی

ہے تو دکان دار بھلا مانس ٹھنڈا پانی پلاتا ہے۔ کوئی بسکٹ

بھی دے دیتا ہے۔ لوگ وہاں آتے ہیں۔ بات چیت

بھی کر لیتا ہوں۔ خبریں مل جاتی ہیں۔ بچیوں کے انتظار

میں بیٹھا تلاوت کرتا رہتا ہوں۔ لوگوں کو نصیحت بھی

کر لیتا ہوں۔ دکان دار بہت ہی شریف بندہ ہے۔ کہتا

ہے باباجی۔ آپ نے جب سے میری دکان پر آنا شروع

کیا ہے میری دکان بہت چلنے لگی ہے۔ یہ آپ کے

تلاوت کرنے سے برکت ہوئی ہے۔ اب بتاؤ۔ اس کا

فائدہ ہوا۔ میرا یہ فائدہ ہوا کہ گھر پڑے پڑے پوتوں کو ڈانٹ ڈپٹ۔ بہو سے لڑتا تھا۔ جب بیٹے نے کہا۔ اباجی۔ آپ آٹھ کو بس تک پہنچا دیا کریں۔ ”برا تو بہت لگا کہ مجھے اپنی بیٹی کا چوکیدار بنا رہا ہے، مگر ہر نظر اتنا تازہ ہوا نے اچھا اثر ڈالا۔ صحت بہتر ہوئی، مزاج بھی۔ صبح بھی ساتھ جاتا ہوں۔ پھر انہیں لینے کے لیے بھی۔ تفریح ہو جاتی ہے۔“

باباجی تقریر کے ماہر۔ خالہ بی سننے پر مجبور اور یہ حقیقت بھی کہ پہلے جو گھر میں بہو کے ساتھ بد مزاجی کے جوہر دکھاتے تھے۔ بیٹے سے شکوے۔ پوتوں سے ناراضی۔ اب کافی خوش مزاج ہو گئے تھے۔ ٹینسہ کو سکون ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار گھر کا سودا بھی لے آتے تھے۔ فارغ وقت میں شاید زاہد کو ارد گرد گرامر اور انگلش بھی پڑھاتے۔ ناجیہ کو شعروں کی تشریح سمجھاتے۔ اب تو دونوں گھروں کی ضرورت بن گئے تھے۔ خالہ بی یوں تو پورے محلے میں بہت مقبول تھیں۔ ان کی بہت قدر و منزلت تھی۔ خود وہ اپنے سب سے قریبی پڑوسی یعنی اپنے کرائے دار سے کسی بھی برائی کی توقع کر سکتی تھیں۔ بس وہی ایک گھر ان کے لیے تشویش کا باعث تھا۔

زیادہ فکر اصباح کی تھی کہ کہیں شرارتا اس کو راستے میں تنگ نہ کرے۔

کرائے دار کا ایک جوان بیٹا تھا۔ ہٹا کٹا۔ اسی سے

خطرہ تھا۔ اسی لیے شروع میں اسے برقعہ پہنایا۔ پھر

چادر بھی بے حد تاکید کے ساتھ۔ بھی کتنی بھی قریبی

سی۔ بھی تو پرانی ذمہ داری۔ اور یہ سیدہ بیگم ہیں

کہ منہ میں گھنٹھیاں ڈالے بیٹھی ہیں۔ بھائی واجد

ہنکارا تک نہیں بھرتے۔ بابا اپنی امانت کی خود حفاظت

کرو۔ میں کب تک اسے دنیا کی تپتی دھوپ سے

بچاؤں گی۔ غلطی ہو گئی مصباح کے بعد۔ فوراً ان

سے تقاضا کرنا چاہیے تھا کہ بھئی۔ اپنے ذمہ داری خود

اٹھاؤ، لیکن اس زمانے میں بچی کا ذہن عجیب ہو رہا تھا۔

کھوئی کھوئی۔ ماں کی موت کے علاوہ گھر سے بے

دخلی۔ بے سہارا ہونے کا احساس۔ بے یقینی کی

کیفیت۔ رفیعہ بھی یوں تو اسے رکھنے پر تیار تھی، مگر اس کے گھر دو جوان لڑکوں کی موجودگی۔ مناسب نہیں لگا۔ اپنی کم مائیگی کے باوجود اللہ کے بھروسے پر ساتھ لے آئیں۔ پھر کسی نے بتایا۔

”واجد بھائی کا بیٹا کینیڈا چلا گیا ہے۔ پڑھائی کرے گا۔ اور پھر کمائی کرے گا۔ ابھی رخصتی سے انکاری ہے۔“ چلو بھئی۔ اس کی کمائی کا انتظار کر لیتے ہیں، مگر کسی نے کہا۔ ”وہ بچپن کے رشتے کو مانتا نہیں۔ اسی لیے بھاگ گیا۔“

ارے۔ لگاتے چار چوٹ کی مار۔ پہلے قبول ہے قبول ہے کہتے ہوئے تو منہ پھسلا نہیں اب سی کر بیٹھ گیا بد ذات۔ منحوس اولاد۔ کہیں نظر آئے ایسی خبر لوں گی کہ بس۔“

”کہاں نظر آئے گا اب آپا! وہ کینیڈا جا چکا ہے۔“ رفیعہ نے کہا۔ ”ماں باپ کو اولاد کی مرضی بھی دیکھنی پڑتی ہے۔“

”واہ۔ یہ کون سی منطق ہے۔ اولاد کی مرضی بدلتی جائے۔ تو ماں باپ بھی بدلتے رہیں۔ ارے بلا میں اسے۔ کریں ٹھکانی۔“

اصباح دیکھتی تھی۔ روز کہیں چلی جاتی تھیں۔ نہ جانے کس کس سے مشورے کر رہی تھیں۔ نتیجہ تو ظاہر ہوتا نہ تھا۔ فکر مند نظر آتی تھیں۔

کبھی اصباح کے ابا کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتیں۔ جو

پہلے ہی بیٹوں کے حوصلے دیکھ کر پست ہو رہے تھے۔

جبواجد بھائی نے ان کی پریشانی دیکھی۔ اپنا بیٹا پیش

کر دیا کہ کم از کم بیٹی کے مستقبل کی طرف سے مطمئن

ہو جائیں۔ انہوں نے بھی فوراً ”مان لیا۔ ابھی چودہ

سال کی تھی اور نکاح کر دیا۔ لڑکا بیس برس کا تھا۔

مناسب جوڑ بھی تھا۔ اپنی صحت اور بیٹوں کی ریشہ

دوانیوں سے تنگ۔ ڈرے ہوئے تھے۔

گھر کو تقسیم کر دیا۔ آدھا حصہ بیٹوں کے حصے میں۔

آدھا اصباح اور اس کی ماں کے لیے۔ اس تقسیم کو

بیٹوں نے ٹھوکر سے اڑا دیا۔ باپ پر مقدمہ کر دیا۔ کئی

رشتے داروں کو ہم خیال بنالیا۔ کئی نے باپ کا ساتھ دیا۔

مگر پھر۔ ابا گزر گئے۔ دباؤ برداشت نہ کر سکے۔ ابا کے جنازے پر بیٹے آئے۔ بہن کو دلاسا دیا۔ مصباح کے پاس آکر بھی چند الفاظ تسلی کے۔ جب ضرورت ہو۔ ہمیں بلا لینا۔ وغیرہ۔

اصباح کو بھائیوں کے سینے سے لگ کر بڑی تقویت ملی۔ وہ کم سن اور نا تجربے کار تھی۔ دو غلی پالیسی تو بڑے بڑوں کی سمجھ سے بھی اوپر ہے۔ وہ سمجھتی تھی۔ دونوں بھائی جو ابا سے ناراض ہو کر اپنے ننھیال میں رہنے لگے تھے۔ ان کی تقویت کے لیے آجائیں گے، مگر انہیں پروا نہ تھی۔ مصباح بہت ڈر گئی تھیں۔ یوں تو کوارٹر میں ایک فیملی رہتی تھی۔ گھر باہر کے کاموں کے لیے۔ اور چوکیداری بھی، لیکن خوف تو بڑھتا گیا۔

اور مقدمے کا فیصلہ جب بیٹوں کے حق میں ہو گیا تو مصباح کا کمزور دل جواب دے گیا۔ علاج جاری تھا کہ پھر۔ اسپتال کے بغیر چارہ نہ رہا۔ اور۔ جس دن معلوم ہوا۔ گھر فروخت کر دیا گیا ہے۔ عدالتی احکام کے تحت خالی کرنے کا نوٹس آگیا۔ پھر کہیں انکی ہوئی سانس بھی واپس نہ آئی۔

اصباح کو اب بھی یھین نہیں آتا تھا۔ بھائی تو بہنوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو اسے چپتی دھوپ میں کھلے آسمان تلے کھڑا کر دیا تھا۔ خالہ بی تو اس کے ابا سے بھی ناراض تھیں۔ اپنی زندگی میں گھر فروخت کر کے سب کو جائز حصہ دے دیتے۔

انہیں اصباح کے دوھیال والے پسند نہ تھے۔ منافق۔ دو غلے۔ باتیں بنانے میں اول نمبر۔ کام کے معاملے میں صفر۔ اگر سب بڑے لڑکوں کو سمجھاتے۔ بہن کی شیمی کا ہی احساس دلاتے۔ درمیان میں پڑ کر مصباح کے لیے کوئی راستہ نکالتے مگر نہیں۔ یوں تو بھتیجیوں کو مصباح کا قاتل، ظالم وغیرہ کہتے رہے۔ یقیناً ”بھتیجیوں کی خوشامد میں ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوں گے۔“

سب کو علم ہو گیا تھا کہ اصباح اپنی خالہ کے گھر ہے۔ مگر کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھنے نہ آیا۔ ذمے داری تو کون قبول کرتا، سب مطلب پرست۔ اصباح

خالہ بی کے تجزیے سن کر شرمندہ ہو جاتی پتا نہیں مصباح بھی کیسا نصیب لے کر آئی تھی۔ ساری عمر شادی کے بعد کی۔ سوتیلے رشتوں سے ڈر ڈر کر گزاری۔ دیکھ لو پھر۔ ان ہی لوگوں نے قبر تک پہنچا دیا۔ بے چاری نے کوئی خوشی نہ دیکھی۔ اصباح کے نکاح سے کچھ سکون ملا بھی تو میاں چلتے بنے۔ وہ بھی بیٹوں کے شور شرابے سے ڈر گئے گو کہ انہوں نے مصباح کو بہت محبت سے رکھا۔ بہت قدر کی مگر۔ نہ جانے ابا میاں نے کیا دیکھ کر مصباح کو دو بیٹوں کے باپ سے بیاہ دیا۔ کاہے کی جلدی تھی مگر جلدی تو تھی۔ تب ہی اپنی زندگی میں اسے گھریار کا کر کے آنکھیں بند کر قبر میں جاسوئے۔

رفیعہ کی بیٹی اجیہ نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

”خالہ بی! مصباح خالہ تو اتنی خوب صورت تھیں اور خالو ابا۔ وہ تو مصباح خالہ کے ابا لگتے تھے۔ پھر ان کی شادی کیوں ہوئی ان سے۔ کسی نے منع بھی نہیں کیا کہ وگنی عمر کے آدمی سے کیوں کر رہے ہو۔“

”کون منع کرتا۔ اے بھی ہمارے ابا میاں۔ توبہ!! اس قدر غصے کے۔ ہتھ چھٹ تھے منع کرنے والے کے ہاتھ پیر توڑ دیتے یا جبراً۔ یا گالیاں دے کر کہتے۔ چل پھر لے آ، کوئی کم عمر لڑکا۔ سب ابا میاں سے ڈرتے تھے بھی۔“

خالہ بی نے تفصیل بیان کی۔

”تو کیا۔ خاندان میں کوئی ان کے جوڑ کا نہ تھا۔“

”بس بیٹا۔ قسمت میں یہی تھا۔ ابا میاں کو یقین تھا۔ کوئی بھیجا بھانجا ان کی بیٹی کا نصیب بنے گا۔ مگر۔ سب اپنی پسند کی یا ماں کی پسند کی کر لائے۔ یہاں بھی غربت حائل تھی۔ ابا میاں ہر کسی سے تو لڑ پڑتے تھے۔ مقدموں میں سارا پیسہ لٹا دیا۔ پھر برہائے کا خوف۔ جو رشتہ ملا۔ بھگتا دیا۔ میں تو شادی میں گئی تھی نہیں غصے کے مارے۔ اصباح کی پیدائش پر گئی تو دیکھا بہت خوش ہے۔ عیش آرام میاں کی چاہت حاصل ہے۔ مگر بیٹے خار کھاتے تھے۔ انجام بھی پھر۔ چلو خیر۔ اب کیا شکوہ۔ اصباح کی فکر ہے اب۔“

”تو خالہ بی! اگر اصباح کے دوھیال والے برے ہیں تو ننھیال والوں نے کیا انعام دیا۔ نکاح کر کے بھول گئے۔ پوچھتے بھی نہیں۔“ اجیہ نے نازک مسئلے کو چھینر دیا۔

”ہاں خیر۔ دیکھتے ہیں۔ یہ سعیدہ بیگم آخر جائیں گی کہاں اور میں بھی بکری نہیں ہوں جو شیر سے ڈر جاؤں گی۔ ایسی خبر لوں گی اسپار گڑوں کی۔ بس دیکھنا۔“ نہ جانے وہ کیا رگڑنا چاہتی تھیں۔

”آپ ہمیشہ سعیدہ مومانی کو کیوں کہتی ہیں۔ واجد ماموں بھی تو ذمہ دار ہیں۔“

”ارے بچی۔ تم عورتوں کی سیاست نہیں سمجھ سکتیں۔ سعیدہ چاہے تو سب ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں پر دولت کی پٹی چڑھی ہوئی ہے۔ ہم اسے غریب غریبا نظر آتے ہیں۔“

اصباح کو تو یقین نہ تھا کہ اب اس رشتے سے کوئی خیر کی خبر ملے گی۔ جو شخص رشتے سے منکر ہو گیا ہے۔ کسی گوری کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہو گا بس پھر قصہ ختم۔ آئندہ نے سمجھایا۔

”نہیں۔ ایسے قصہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ جو خاندان ہوتے ہیں۔ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہونے دیتے معاملہ۔ لہذا چکر ہوتا ہے۔“

اصباح سوچنے لگی۔ خاندان؟ کون سا خاندان۔ وہ تو ایسے کسی خاندان سے واقف نہ تھی جو اس کے معاملے میں مددگار ہوتا۔ ننھیال ان ہی لوگوں کا ساتھ دے گی۔ دوھیال کو اس کی فکر ہی نہیں۔ خبر تک نہیں لیتا کوئی۔ پھر۔ خاندان کہاں سے آئے گا۔

خالہ بی اپنی تک و دو میں لگی ہوئی تھیں۔ بس خبریں۔ جو اس تک آئیں لڑکا کینڈا بھاگ گیا۔ اسے رخصتی نہیں کروانی۔ بچپن کی شادی۔ گڈے گڑیا کی شادی ہو گئی۔ ہائیں۔ بیس برس کا جوان مرد کیا بچہ تھا؟ ننھا دو وہ پیتا۔ خالہ بی تو اسے ہر خبر سے بے خبر رکھنا چاہتی تھیں مگر اسے کچھ نہ کچھ علم ہو ہی جاتا تھا۔ ثریا کی شادی کا کارڈ آگیا۔ مہندی میں بھی بہ اصرار بلایا تھا۔ خالہ بی نے اسے اچھی طرح تیار ہونے کا حکم دیا۔

”وہ پیلا جوڑا پس لینا جس پر ادوی تیل لگی ہے۔“
 ”وہ تو بہت بھاری ہے۔ افراز بھائی کہہ رہے تھے
 بہت سادگی سے گھر میں مہندی ہوگی۔ خاندان کے ہی
 لوگ آئیں گے اور کچھ پڑوسی۔ دولہا والے نہیں
 آئیں گے۔“

”نہ آئیں۔ ہمیں تو خاندان والوں کو بھی دکھانا
 ہے۔“

مجبوری۔ ان ہی کی پسند کے کپڑے پہننے پڑے۔
 انہوں نے موتیوں کی لمبی لڑیوں والے بندے چھپی پہنا
 دیے۔ بلکہ آئندہ کو بلا کر اس کا میک اپ کرایا۔ اصباح
 کو بڑی شرم آئی۔ کبھی میک اپ کیا نہ تھا اس کے انکار
 پر آئندہ نے ڈانٹا۔

”چپ رہو۔ تم شادی شدہ ہو۔ میک اپ کا حق
 ہے۔“

”اچھا جی۔ مجھے کیا کیا حق ہے بتانا اور جو نہیں ہے۔
 وہ میں بتاتی ہوں۔“ اصباح کو غصہ آگیا۔ ”مجھے بولنے کا
 حق نہیں۔ بننے کا حق نہیں۔ گلی میں یا کہیں بھی
 راستے میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کا حق نہیں۔
 چھت پر جانے کا حق نہیں۔“ آئندہ کو ہنسی آگئی۔

”ارے۔ حق اسے نہیں کہتے۔ اسے کہتے ہیں
 اجازت۔“ اصباح منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

”اب تم میرے کیے کرائے پر پانی نہ پھیرونا منہ بنا
 کر۔ اتنی اچھی شکل بگاڑ رہی ہو۔“ اس نے آئینہ
 سامنے رکھا۔ آہا۔ اسے اپنی صورت کبھی اتنی پیاری
 نہیں لگی تھی۔

”ایک بات بتاؤ۔ اس میک اپ کا۔ اتنے اچھے
 کپڑے پہننے کا۔ اوپر سے یہ لمبے بندے مجھے کیا فائدہ
 ہوگا۔ آج یہ نیا فرمان جاری ہوا ہے۔ اس کا مقصد کیا
 ہے؟“

”تم تو ہو گھامڑ۔“ آئندہ پھر ہنسی۔ ”وہاں آئیں گی
 تمہاری ساس۔ انہیں تم آؤگی پسند۔ وہ بیٹے کو بتا میں
 گی کہ اصباح اتنی حسین، پری چہرہ ہے کہ کینیڈا کی
 بھوری بندریاں اس کے سامنے گھاس چرتی ہیں۔ پھر
 دیکھنا۔“

”وہ مجھے ہزار بار دیکھ چکی ہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔
 ”اس طرح۔ اس حلیے میں کبھی نہیں دیکھا۔
 ہمیشہ روتی بسورتی دیکھا ہے اور ان کے سامنے ہنستی
 رہتا۔ یہ جتانے کے لیے کہ تمہیں ان کی پروا ہے نہ
 ان کے بیٹے کی۔“

”ہائیں! یہ۔ یہ خالہ لی نے کہا ہے؟“
 ”یہ مابدولت کے ارشادات ہیں۔“ فخر سے سینہ
 تان کر بولی۔ اصباح مسکرا دی۔

ثریا زعفرانی کپڑوں میں ہلدی کی گانٹھ بنی بیٹھی
 تھی۔ بہت خوش ہو گئی۔ اپنے پاس بٹھا کر اس کے نئے
 روپ کی تعریف کی۔ کافی رشتے دار جمع تھے۔ اصباح
 سب سے ملی ”وہ“ مگر نظریہ آئیں۔

سب نے اصباح کی تعریف کی۔ ”کتنی پیاری ہو گئی
 ہے اصباح۔ ہائے۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ وغیرہ۔
 ”اپنی اٹریا پہ گڑیاں کھملن تھی۔ ساجن نے بھیجے
 کمار ری۔

اے ری سکھی گڑیاں کھملن نہ پائی سیاں کے پنچے
 کمار ری۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مہوا۔ کہ ساون کی آئی پھوار
 رے۔“

لڑکیاں امیر خسرو کا کلام بے حد سراور لحن سے سوز
 کے ساتھ گارہی تھیں۔

اپنے باغیچے میں پھلوا چنت تھی ساجن نے بھیجے
 کمار ری۔

اے ری سکھی پھلوا پہنن نہ پائی سیاں کے پنچے
 کمار ری۔

اپنے محلوا میں جھولا جھولت تھی ساجن نے بھیجے
 کمار ری۔

اے ری سکھی جھولا جھولن نہ پائی سیاں کے آئے
 کمار ری۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مہوا کہ ساون کی آئی پھوار
 رے۔“

”ارے یہ کیا ساون شروع ہو گیا۔ شادی مہندی
 کے گیت گاؤ۔“ کسی نے کہا۔

”خالہ! سسرال میں ایسے ہی دل مار کر رہنا پڑتا ہے لڑکیوں کو۔ اپنی مرضی کب چلتی ہے۔“
 ”اور ساجن کم بخت کو دیکھو۔ ڈولا بھیجنے کی آفت پڑی تھی۔ نہ بچاری جھول سکی نہ پھول پن سکی۔ ساون تو منانے دیتا۔ مگر بچاری لڑکیاں۔“
 ”وہ بھی بیگم کے ساتھ ساون منانا چاہتا ہو گا۔ بیگم کو دیکھو رستے میں ہی ڈولا رکھوا کے ساون کی پھوار کا لطف لینے لگیں۔ تب ہی سسرال والے بہو سے ٹالاں ہوتے ہیں۔ من موچی۔ بے کسے کی۔“
 ”تو بہ ہے۔ اب سسرال سے ڈراؤ تو نہیں بچاریوں کو۔ چلو وہ گاؤں ماں میرے ابا کو بھیجوری۔“ لڑکیاں فوراً شروع۔

اماں میرے ابا کو بھیجوری کہ ساون آیا
 بیٹی تیرا ابا تو بڑھاری کہ ساون آیا
 اماں میرے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا
 بیٹی تیرا بھیا تو بالاری کہ ساون آیا
 اماں مرے چچا کو بھیجوری کہ ساون آیا
 بیٹی تیرا چچا تو بازکاری کہ ساون آیا
 ”لو دیکھا! میکے میں کون سی قدر ہے۔ ماں ہے کہ صاف انکار کر رہی ہے کہ بھی اب تم گھریار کی ہو۔ سسرال میں دل لگا کر رہو۔ ساون بھادوں کا زمانہ گیا“
 ”میکہ بھی تمہارا غلام نہیں۔“
 ”ہاں ماں بھی کتنی ظالم۔ بیٹی رہ سسرال۔ چاہے جتنی پابندیاں ہوں وہاں۔“
 ”افہ شمیلا“ نہ دہلاؤ لڑکیوں کو۔ کل سب کو جانا ہو گا۔ اور ساون میکے میں کرنے کی اسے ضرورت کیا ہے۔ میکہ ہو کہ سسرال۔ ساون سب جگہ ایک جیسا کچڑ پلنی۔ سلن۔ جس۔“
 ”اور کیا۔ سسرال میں جھولا ڈال کر میکے کا مزالو۔ اتنا شوق ہے تو۔“

”وہاں جھولے جھولتی رہو۔ گھر کی فکر نہ کرو نہ بچے سنبھالو۔ نہ میاں کو دیکھو۔ بھئی عقل مند ماں یہی سمجھانا چاہ رہی ہے کہ بہت جھولے جھول لیے۔ ساون منالیا۔ اب گھر سنبھالو۔ دل لگاؤ سسرال میں۔“

”اماں ڈر رہی ہو گی کہ بیٹی کہیں میکے میں ہی نہ آن برا ہے۔ ماں کے سینے پر مونگ دلنے۔“
 ”یا اللہ یہ مہندی کی رسم بھی ہو گی کہ سب دل کے پھپھولے پھوڑنے آئی ہیں۔ چلو بچیوں! ثریا کو لے کر آؤ۔ یہ امیر خسرو بھی۔ عورتوں کے دل چیرنے والے گانے ہی بھلا کیوں بناتے تھے۔ چلو سب وہ گاؤں شادمانی ہو۔ شادمانی۔“

اب موسم اور ماحول بدل گیا۔ اب قمقمے تھے۔ چچھے تھے اور چھیڑ خانیاں۔
 ”ارے۔ رفیعہ! سعیدہ نہیں آئی۔“ خالہ بی نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔ ”بلایا تھا؟“ کان میں منہ ڈال کر کہا۔ شور بہت تھا۔ ہاؤ ہو۔

”بلایا تھا آیا! منہ چڑاتی ہیں سب سے۔ سنا ہے چار سال بعد بیٹا بھی آگیا ہے کینڈا سے۔ بہت کما کر لایا ہے۔ شادی وادی کا تو پتا نہیں۔ لایا تو نہیں کسی کو۔“ خالہ بی کا بوجھ ہلکا ہوا۔

”خنا گوندھ لائی ہیں پریاں۔ تیرے لیے بنو میری تیرے لیے۔“
 ”ماتھے پہ ترے چمکیں ستاروں کی لڑیاں“ ترے لیے۔ بنو میری ترے لیے۔

لڑکیوں نے نیا گانا شروع کر دیا۔ خالہ بی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سب سے الگ اصباح کوٹنے میں بیٹھی تھی۔ ہا۔ دل دکھ گیا۔ بچی کا دل کیسا مردہ ہو گیا ہے۔ نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے۔ نصیبوں والی ہو۔ ابھی تو سب بادلوں میں گم ہے۔ خوشیاں بھی۔ مستقبل بھی۔ نصیب بھی۔

اچانک بادل آئے۔ پھوار شروع ہوئی۔ بڑی عمر کی خواتین اندر آ گئیں۔ لڑکیاں صحن میں ہی چہلپھل کرنے لگیں۔ اصباح بھی ثریا کے ساتھ اندر آ گئی۔
 ”اے بی! ثریا نے کیا پٹیلی چائی ہے۔ بے موسم برسات شروع ہو گئی۔“

”اللہ کی رحمت ہے۔ نیک شگون ہوتا ہے۔ مبارک ہو۔ بیٹی نصیبوں والی ہے۔“ کسی نے کہا۔
 کھانا جلدی لگا دیا گیا۔ بارش کی وجہ سے سب

مہمان بھی جانے لگے۔ افراز، خالہ بی اور اصباح کو گھر چھوڑنے آیا۔ خالہ بی کو اس پر بہت پیار آیا۔ بہت ذمہ دار بچے ہیں رفیعہ کے۔ کیا رنگ نکالا ہے۔ مرنے والے بہنوئی پر غصہ آیا، پاس کے پاس۔ پڑوس میں رہنے والے لڑکے نظر نہ آئے۔ اتنی دور واجد بھائی مل گئے۔ ارے، ذرا عقل کے گھوڑے دوڑاتے، ساتھ ہی تو گھر تھا۔ ہم خود رفیعہ سے کہتے۔ مصباح سے رفیعہ کی دوستی بھی تھی۔ ہا ہا۔ کیسا اچھا موقع نکل گیا۔



شادی کے دن بھی اصباح کو بنا سنوار کر گلابی سوٹ پہنا کر لے گئیں۔ آج تو سعیدہ کے سینے پر سائب لوٹیں گے ضرور۔ ایسی نرالی چھب ہے کہ نظر ہنسی نہیں۔ جب وہ شادی ہال پہنچیں۔ تو وہاں سعیدہ نظر نہ آئیں۔ مردانے میں واجد بھائی بھی نہ تھے۔ اگر آج بھی نہ آئیں تو ان کی مجوزہ اسکیم ناکام ہو جائے گی۔ بارات آگئی۔ خواتین لائن سے گزرنے لگیں۔ لڑکیاں انہیں ہار پہنا رہی تھیں پھر ایک خاتون کے پیچھے سعیدہ نظر آئیں۔ رفیعہ نے ہنس کر کہا ”بھابھی! بارات کے ساتھ آئی ہو کیا؟“ وہ کھلکھلائیں۔ ”ارے بھئی، باراتی ہوں تو نہیں۔ دیکھو تمہاری لڑکیوں نے ہار پہنا کر باراتی بنا دیا۔“ خالہ بی سکھ کا سانس لے کر سی پر ڈٹ گئیں۔ نکاح ہو گیا۔ کھانا ہو گیا۔ اب تصویریں بن رہی تھیں۔

سعیدہ جو کم ہو میں تو اب ملیں۔ خالہ بی فوراً لپکیں۔

”اے جی۔ ادھر تو آؤ۔ کہاں چھپی چھپی پھر رہی ہو۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”اے۔ اے۔ نا بابا۔ جو بات کرنی ہے۔ اپنے بھائی سے کرنا۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔“ صاف دامن بچا رہی تھیں۔ بوکھلائی ہوئی تھیں۔

”کیوں۔“ سنھی چوڑہ ہو۔ ارے بھئی تم سے ہی جواب لینا ہے۔“

”جو بھی آپ سمجھیں۔ میں کچھ کہہ کر بُری نہیں

بنوں گی۔ اپنے بھائی سے بات کریں۔“

”میں تمہیں بُرا کیوں بناؤں گی۔ بلاؤ اچھا بھائی کو۔“

”وہ نہیں آئے۔ انہیں شادی کے شور شرابے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔“ آگے بڑھ گئیں۔ گویا ان کے گھر جا کر ان ہی سے بات کرنی ہوگی۔ اگر لڑکا مل گیا تو اس کو تو۔۔۔

ثریا کی رخصتی کے بعد وہ رفیعہ کے اصرار پر ان ہی کے گھر آئیں۔ ٹینے کو فون کر دیا کہ ان کے جڑواں بچے وہاں سو جائیں۔ گھر کی ایک چابی ٹینے کے پاس ہوتی تھی۔ احتیاطاً۔۔۔

اصباح کو اجیہ نے ثریا کے دھلے ہوئے کپڑے رات کو سونے کے لیے دے دیے۔ باتیں کرتی رہی۔ مہمانوں پر تبصرے۔ دولہا کا ذکر۔ پھر ایک دم کچھ یاد آیا۔ ”رخصتی کے بعد میں جب دوسرے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے باہر کھڑی تھی۔ تو۔۔۔ میں نے وہاں واجد ماموں کے بیٹے کو دیکھا۔ وہی۔۔۔ تمہارا والا معین۔ گاڑی سے اتر کر اندر آ رہا تھا۔“ اصباح نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”نہیں۔ کوئی اور ہوگا۔ وہ یہاں کہاں؟“

”وہی تھا بھئی۔ لمبا گورا، گولڈن بال اور ہاں اسی وقت سعیدہ موہانی میرے پیچھے سے نکل کر آگے گئیں اور اسے دھکیلتی ہوئی گاڑی کی طرف لے گئیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسے اندر آنے سے روک رہی تھیں اور پھر دونوں ایک گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ہائے سچی۔ اگر وہ اندر آ جاتا۔ تمہیں دیکھ لیتا پھر تو۔۔۔ افوہ! آج تم اتنی حسین لگ رہی تھیں کہ بس۔ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ بھول جاتا گوری لڑکیوں کو۔“

”نہیں۔ دوسرا والا ہوگا۔ تم نے کیا ان کے تینوں بیٹوں کو دیکھا ہے۔ پہچانتی ہو؟“

اصباح بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گردن ہلائی۔ ”ہاں۔ پہچانتی ہوں۔ وہ جب کینیڈا سے آیا۔ زرو خالہ نے دعوت کی تھی۔ میں زرو خالہ سے کراس اسٹیج کی کاپی لینے گئی تھی۔ اس دن سب کو

دیکھا۔ زرو خالہ کی بیٹی نے بتایا کہ معین آگیا ہے۔ اس کی دعوت ہے۔“

اصباح گم صدم ہو گئی۔ یہ کم عمر لڑکی سوچ سکتی ہے کہ وہ اندر آتا تو مجھے دیکھ کر۔ تو۔ سعیدہ مومانی نے یہ کیوں نہیں سوچا۔ نہ جانے کب آیا اور۔ آج بہانے سے ہی آکر دیکھ لیتا۔ کیا سعیدہ مومانی واقعی مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں؟ آج وہ بہانے بہانے سے ان کے پاس سے گزری۔ مسکرا کر سلام بھی کیا۔ انہوں نے خشک لہجے میں جواب دے کر منہ موڑ لیا۔ نہ پہلے کی طرح گلے لگایا نہ پیار کیا۔ دوسری دفعہ پھر وہ ان کے پاس گئی۔ وہ کسی خاتون سے مخاطب تھیں۔ شاید اپنے دوسرے بیٹے کے لیے جو دبئی میں ہوتا ہے۔ کسی گوری حسین امیر گھر کی لڑکی بتانے کا کہہ رہی تھیں۔ دوسرا کیوں؟ پہلے کے لیے بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس وقت وہ یہی سمجھی کہ دوسرے بیٹے کا ذکر ہوگا۔

اجیہ تو سو گئی لیکن اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ تکیہ کب آنسوؤں سے تر ہوا۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ اپنی قسمت پر۔ کم مائیگی پر۔ تنہائی پر۔ نہ جانے کس کس پر آنسو بہتے رہے۔ ماں باپ بہت ضروری ہوتے ہیں۔ بغیر ماں باپ کے۔ زندگی بے کار کیوں ہوتی ہے؟ دنیا کے اتنے بہت سے لوگ۔ ان میں کوئی اس کے ماں باپ کیوں نہیں ہیں۔ دو بھائی تھے۔ اگر ابا کے رشتے سے ہی اس کا خیال کر لیتے۔ وہ یوں ذلیل تو نہ ہوتی۔ اب اندازہ ہو گیا بحسن صورت جوانی سب بے کار۔ ماں باپ ہوں اور کچھ مضبوطی یعنی پیسہ۔ آج کل وہی کام آتا ہے جیسے مومانی دولت مند لڑکی کا کہہ رہی تھیں۔ رشتہ خاندان خوب صورتی سب گئے بھاڑ میں۔



شادی کے لیے تین دن کی چھٹی لی تھی مگر طبیعت کچھ اتنی سست ہوئی کہ چوتھے دن بھی نہ جاسکی۔ بستر سے اٹھا ہی نہ گیا۔ کیسی کمزوری تھی یا اداسی۔ جسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نام کے سوا کچھ علم نہیں۔ واجد ماموں

ہمیشہ ٹرانسفر کے چکر میں دوسرے شہروں میں رہتے رہے۔ بیٹیوں کی شادیاں بھی کسی اور شہر میں کر دیں۔ لڑکے غالباً کراچی میں پڑھتے تھے۔ کسی خاندان کی شادی وغیرہ میں بھی نہیں دیکھا۔ وہ اگر۔ مجھے دیکھنا نہیں چاہتا۔ ملنا نہیں چاہتا تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ کہتے ہیں۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تو صرف میرا دل ہی اس کی طرف کیوں ہمکتا ہے۔ اس ایک نام پر دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ اسے کیوں میری طلب نہیں ہوتی۔

”تم نے یہ چار دن ضائع کر دیے۔“ آثمہ نے اس سے کہا۔ ”امتحان کے اتنے قریب ایک دن کا ناغہ بھی نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔“

وہ جانتی تھی مگر شادی بھی ضروری تھی۔ ”ہاں یہ آخری دن ضائع ہو گیا۔ زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔“ ایک دن گھر آتے ہوئے آثمہ نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں نے نوٹ کیا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک لڑکا ہمارا پیچھا کرتا ہے۔ کلج سے یہاں تک۔“ اصباح ڈر کر رک گئی۔

”افوہ۔ چلتی رہو۔ ورنہ دادا پوچھیں گے کیا ہوا۔“

”لیکن۔۔۔ وہ کون ہے؟“

”پتا نہیں۔ گلی کے پاس رک کر موٹر سائیکل پر جھک جاتا ہے جیسے خراب ہو گئی ہو۔ میرا خیال ہے۔ وہ دادا کی لائٹھی سے ڈر کر وہیں رہ جاتا ہے۔ پیچھے نہیں آتا۔“

”ہوں ہوں۔“ دادا نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ کیا کھسر پسر ہو رہی ہے۔“

”کچھ نہیں دادا ایسے ہی۔ بس۔“ لوجی اب دادا بھی پابندی لگا رہے ہیں۔

”ایسے ہی کیا۔ میں نے سنا تھا تم لائٹھی کا ذکر کر رہی تھیں۔“ بہرے تھے مگر اتنے بھی نہیں۔

”دادا! اصباح کہہ رہی تھی دادا کی لائٹھی بڑے مزے کی ہے۔ ٹھک ٹھک کرتی ہے۔ کسی کے سر پر لگ گئی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔“ آثمہ نے بات بنائی۔

دادا نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ ”تو کھائے گی؟ مزا لینا ہے۔“



”وہ کھسے کی اوٹ میں کھڑا ہے۔“ اگلے دن پھر آمنہ نے سرگوشی کی۔

”محلے کا ہے؟“ اس نے بھی زیر لب پوچھا۔

”نہیں۔ غیر ہے۔ ورنہ دادا تو پہچان لیتے۔“

”تمہارے لیے آتا ہو گا۔“ اصباح نے کہا۔

”لگتا تو نہیں وہاں کھڑے ہو کر۔ تمہاری طرف دیکھتا رہتا ہے۔“

”ہائے۔ نہیں بھی۔“ اصباح کا تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ لڑکھڑائی۔

”ہاں۔ میں بس سے اترتے ہی اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ اسے مجھ سے نہیں۔ تم سے وہ ہے۔“

”مجھے کیوں نظر نہیں آتا۔“ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

”تم کو نظر آتا بھی ہے کچھ۔ منہ ڈھانک کر ناک کی سیدھ میں چلتی ہو۔“

”مجھے یوں اندازہ ہوا کہ تم جب شادی میں گئی تھیں۔ دادا نے پوچھا۔ تمہاری کسبیلی نے کتنے دن کی چھٹی لی ہے۔ میں نے کہا۔ دادا تین دن کی۔ وہ تین دن

نہیں آیا۔ چوتھے دن آیا۔ بے چارا۔ تم نے اس دن بھی چھٹی کر لی تھی۔“ دادا کو سمجھانے کے لیے زور سے بولی تھی۔

”خالہ بی کو نہ بتانا۔ وہ میرا کالج جانا بند کر دیں گی۔“

”میرا خیال ہے انہیں بتا دو۔ وہ کوئی حل نکال لیں گی۔ بعد میں کوئی بات ہوئی تو خفا ہوں گی کہ مجھے کیوں

نہیں بتایا۔“

مگر وہ خالہ بی سے کہہ کر اپنی شامت بلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ واقعی ادھر ادھر دیکھے بغیر بس سے اتر کر گلی میں گھس جاتی تھی۔ دادا اپنی لائٹھی ٹھک ٹھکاتے پیچھے

ہوتے ہی تھے۔ اب یہ نئی آفت۔ دروازہ خالہ بی نے کھولا۔ سلام کیا۔ جواب دے کر اندر آتے ہوئے بغور

اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔“ (اب اسے کہتے ہیں اڑتی چڑیا کے پر گننا۔)

”کچھ نہیں۔ وہ گلی میں پیر مڑ گیا تھا۔“ بیٹھ کر نخنے سلانے لگی۔

”دونوں مڑ گئے تھے؟“ (اللہ جی۔ کدھر جاؤں۔ حماقتیں تو پھر چونکاتی ہیں۔)

”نہیں۔ اس میں تو۔ کھجلی ہو رہی ہے۔“ دوسرے نخنے سے ہاتھ ہٹایا۔

”اچھا بیٹھو، نہیں۔ منہ دھولو۔ مڑ بگھاڑ دیے ہیں۔“ چاول بھیکے ہوئے ہیں۔ چولہا جلا کر پانی چڑھا، پک

جائے تو چاول ڈال کر ڈھکن بند کر دینا۔ سارا مسالا میں نے ڈال دیا ہے۔ راستہ مسلا دینے رکھے ہیں۔ میں ذرا

یہ رضائی پوری کر لوں۔“ اب غور کیا۔ برآمدے میں کچھی چادر پر رضائی پھیلی ہوئی تھی۔

”ہاں۔ کتنی خوب صورت ہے۔ خالہ بی کس کی ہے؟“ رک کر دیکھنے لگی۔

”تمہیں اچھی لگی۔ لے لیتا۔“ مسکرائیں۔ ”میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ زعفرانی اور

ادوارنگ کتنا کھل رہا ہے۔“ ”کپڑا رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ چلو رضائی سی لوں۔

جینز میں رکھ دوں گی۔“ وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔ ”آپ ہی لے لیں۔ کیا ضرورت ہے جب کچھ ہونا ہوا نا

نہیں۔“ ”یا گل ہو۔ میں یہ شو خم شو خارنگ کی رضائی استعمال کروں گی اس عمر میں۔“

وہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ خالہ بی متفکر نہ جانے کچھ سن گن مل گئی ہے یا کیا۔ اس دن کے بعد سے تو وہ

اور بھی محتاط ہو گئی۔ آمنہ نے ہنس کر بتایا۔

”اوہو۔ منہ ذرا سا کھول لو بھی۔ اس وقت دوپہر میں گلی خالی ہوتی ہے اور وہ تمہیں دیکھ چکا ہے۔“

”ہیں؟ کب؟ مجھے ڈراؤ تو نہیں۔“ اور دو تین دن تک بقول آمنہ کے وہ آیا نہیں تھا پھر کب

دیکھا؟ آمنہ نے اصرار کے باوجود اس بات کا جواب

نہیں دیا۔

وہ چاہتی تھی۔ اس سے پوچھے۔ کون ہو۔ کہاں کے ہو۔ یہاں کس کی تلاش میں آتے ہو اور اگر آٹھمہ کے لیے آتے ہو تو۔ چلو پھر۔ لیکن میں۔ نکاح کے چند بولوں کی قیدی ہوں (بے شک اس نے مجھے اور میں نے اسے نہیں دیکھا)۔ لیکن۔ ہمت کہاں سے لاتی۔ ذہن بے سکون ہو گیا تھا اور امتحان کی سختی۔

”کتنے پیپر رہ گئے ہیں اب تمہارے۔“ خالہ بی نے پوچھ لیا۔

”نفس۔ شکر ہے۔“ اس نے نیند سے مغلوب آنکھیں کھولیں۔ جمالی لی۔

”اس طرح جمالی نہیں لیتے۔ یہ شیطان کی کارستانی ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے بندہ سو جائے اور نماز سے غافل ہو جائے۔“

اصباح شرمندہ ہو گئی۔ وہ بھی نماز ٹال کر سونے کی فکر میں تھی۔ خیر۔ شکر کہ پیپر اچھے ہو گئے۔



خالہ بی، ٹینہ آنٹی کے گھر کسی کو فون کرنے گئی تھیں۔ منہ لٹکائے واپس آئیں۔ متفکر اور مشتعل۔ اگلے دن آٹھمہ نے فون کا عقدہ کھولا۔ ”تمہارے واجد ماموں کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہم اسے بہت سمجھا رہے ہیں۔ سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ اسے یعنی ان کے بیٹے کو بچپن کے رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے چھ سات سال جو کینیڈا، امریکا وغیرہ میں گزارے ہیں تو اس کا آج کل کی لڑکیوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہاں سے اسی لیے آگیا کہ کسی لڑکی کا کیریئر صحیح نہیں لگا۔ اب یہاں۔ اگر شادی کرے گا تو دیکھ سمجھ کر۔ کیوں کہ یہاں بھی اسے بہت آزادی نظر آرہی ہے۔“

واجد ماموں کی بات خالہ بی نے ٹینہ آنٹی کو۔ انہوں نے آٹھمہ کو ”آٹھمہ نے اس کو سنائی۔“

”پھر خالہ بی نے ان کو دھمکیاں اور طعنے دیے۔ یہی کہ تم لوگوں کی آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ غریب

سمجھ کر یتیم بچی سے نظر چرا رہے ہو۔ اس کی زندگی تباہ کر کے پھر تمہارا بیٹا بھی آباد نہیں ہو گا۔ وغیرہ۔“

اصباح اداسی کے طوفان سے گزر رہی تھی۔ نہ جانے وہ اسے دیکھنے پر کھنے آکیوں نہیں گیا مہربانو، شہر بانو ہی اسے لے آئیں۔ سعیدہ مومانی۔ شاید وہ ہی نہیں چاہتیں۔

امتحان کا آخری دن آگیا۔ دروازے کی بیل بجائی مگر دروازہ ہنوز بند۔ دستک دی۔ ہائے اللہ۔ خالہ بی دروازہ کیوں نہیں کھول رہیں۔ انہیں کچھ ہونہ گیا ہو۔

کہتی رہتی تھیں۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ آدمی بلبلایا پانی کا۔ ایک ہچکی اور زندگی تمام۔ گھبرا کر گھنٹی پر انگلی زور سے دبا لی۔ دادا پیچھے کھڑے لاشی سے ٹھک ٹھک کر رہے تھے۔

”آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔ صبر کرو۔“ آف ان کی آواز۔ دل ٹھکانے آگیا۔

”چلو۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔“ کہتی ہوئی دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئیں۔ ”میں نکلنے ہی والی تھی۔ چلو تم کو ٹینہ کے گھر چھوڑ دوں۔ ایک جگہ جانا ہے۔“

”نہیں۔ وہ آٹھمہ تو جاتے ہی سو جائے گی۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ آپ کتنی دیر میں آئیں گی۔“

”ٹھنڈ تو لگ جائے گا یا کچھ زیادہ۔ کہہ نہیں سکتی۔ اکیلے میں ڈر دگی تو نہیں۔“

”سو جاؤں گی تو ہوش کہاں رہے گا۔ جاگ جاگ کر۔ برا حال ہے آپ آئیں تو گھنٹی زور سے بجادیں۔ ہاں میں دروازہ اچھی طرح بند کروں گی۔ بغیر معلوم کیے کھولوں گی نہیں۔“

خالہ بی اصل میں کرائے داروں سے کسی بھی برائی کی توقع کر سکتی تھیں۔ گو کہ آج تک ان بے چاروں نے کوئی نازیبا حرکت کی تو نہیں تھی، مگر دشمنی۔ مخالفت میں کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

”اچھا۔ پھر بھی احتیاطاً“ اطمینان کر لینا۔ فوراً نہ کھول دینا کنڈی۔ ”بڑی تیار شیار نظر آرہی تھیں۔ چکن کا سوٹ پہنے سفید پرس۔ سفید سینڈل واہ۔ میچنگ۔ اس نے اندر کھس کر دروازہ بند کیا۔ وہ وہیں

پھونکے بغیر ہی۔۔۔ خالہ بی آگئی تھیں۔ اور ان کی آواز
صور سے کم نہ تھی۔

”ارے۔ ارے۔ اے بھیا۔ تم ہو کون۔ کیسے
میرے گھر میں گھسے چلے آئے۔ قبضہ کرنا ہے؟ اور
مطلب کیا ہے۔ ہٹو۔ نکلو۔ بلواتی ہوں پولیس کو۔ ابھی
میری ایک آواز پر محلہ دوڑا آئے گا اور یہ لڑکی کدھر
ہے۔ اس نے دروازہ کھولا کیسے۔ جب میں منع کر کے
گئی تھی۔ دفع ہوا اپنے بیک شیٹ لے کر۔ ارے۔
ارے کہاں چڑھا چلا جا رہا ہے منحوس۔“ وقفے کے بغیر
ایک سانس میں بولتی گئیں۔

”اماں‘ میری اماں‘ پیاری اماں۔“ اصباح نے
کھڑے ہو کر بند دروازے کی جھری سے جھانکا
برآمدے میں سوٹ کیس بے ترتیبی سے رکھے تھے۔
ایک تو مندو جوان خالہ بی سے لپٹنے کو تھا۔

”دو موئے۔ خبردار۔ ہٹ پرے۔ میں نہیں جانتی
تو ہے کون۔ مردود نہ ہو تو۔“

سرخ آنکھیں اگ اگلتی آواز۔ اور وہ لڑکا ان سے
لپٹے جا رہا تھا۔ ”اماں معاف کر دو۔ میری اماں۔ میں
ضرار ہوں۔ آپ کا اپنا بیٹا۔ صبح پہنچا ہوں امریکا سے۔
سامان نکلوانے میں دیر ہو گئی۔“

”جو بھی ہو۔ کالے چور کی اولاد۔ میری اجازت کے
بغیر میرے گھر میں گھسا کیوں؟ غضب خدا کا۔ دن
ویہاڑے ڈاکا۔ ڈاکو آگئے۔“

”اچھا۔“ نومی یار! شکریہ۔ تم جاؤ‘ میں اماں کو
منالوں گا۔“ دو سرا لڑکا گردن ہلاتا باہر کی سمت میڑ گیا۔
ضرار ماں کے جملوں کے بیچ میں بولے جا رہا تھی اور
ایماں کمر پر ہاتھ رکھے خونی نظروں سے اسے گھور رہی
تھیں۔

”وہ۔ آپ کی نوکرانی۔ دروازہ کب کھول رہی
تھی۔ پھر میں نے اسے دھمکایا۔ تو۔ آپ نے بہت
ٹائٹ رکھا ہوا ہے اسے۔“ پھر آگے بڑھا۔ اماں پیچھے
ہٹیں۔ بدک کر۔

”ارے ہٹ منحوس۔ پاس نہ آنا۔ یہی بہت سمجھ
کہ زندہ سلامت کھڑا ہے۔ یہ۔ یہ ڈنڈا دیکھ رہا ہے؟

کھڑی رہیں باہر سے نور لگاتی رہیں بار بار کہ کھل تو نہ
جائے گا دروازہ۔

جب وہ مطمئن ہو گئیں۔ تو اصباح دونوں چٹخیاں
چڑھا کر اندر آئی۔ کپڑے بدلے۔ کچن سے ایک سیب
اٹھا کر کھایا اور کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اب صرف
فراغت کا احساس تھا۔ نہ کوئی سعیدہ موسانی۔ نہ کوئی
منکوح۔ نہ گلی میں کھڑا لڑکا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی نیند
کے جھولے جھولنے لگی۔ آہ۔ آزادی گھنٹی کی کرخت
آواز۔ اوقف۔ کس نے ایجاد کی ہے یہ خوف ناک
آواز والی چیز اور جب صور پھونکا جائے گا۔ میرے
اللہ۔ تو۔۔۔ زبردستی آنکھیں کھول کر لڑکھڑاتی۔ ڈگمگاتی
پہنچی پھر گھنٹی۔۔۔ پھر صور پھونکا گیا۔
”کیا ہے۔ کون ہے بھئی؟“

آواز آئی۔ ”میں ہوں۔ ضرار محی الدین۔“

”کون؟ میں نہیں جانتی۔ اگلا دروازہ کھٹکھٹائیے۔“

”ارے میں ضرار ہوں۔ یہاں جو حفصہ بیگم رہتی

ہیں۔ ان کا بیٹا۔ امریکا سے صبح ہی پہنچا ہوں۔ سامان

نکلوانے میں دیر ہو گئی ورنہ صبح ہی آجاتا۔ اماں کو بتادو۔

ان کا بیٹا ہے اور اگلا دروازہ بھی اسی گھر کا ہے۔ یہ گھر

میرے نانا کا ہے۔ کھولو۔“ ”یا اللہ مشکل آسان کرنا۔

دھم۔ وہ تو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ آئے۔ آپ پھر

آجائیں۔“

”ارے واہ۔ اتنا سامان لے کر کہاں جاؤں۔ کھولو

دروازہ ورنہ میں دھکا دے کر توڑ دوں گا۔ میں ضرار محی

الدین باڈی بلڈر بھی ہوں۔“ کہیں واقعی۔۔۔ نشانیاں

بھی صحیح بتا رہا تھا۔ اللہ کا نام لے کر دروازہ کھولا۔

سامنے سوٹ کیسوں‘ مختلف سائز کے بیگوں اور تھیلوں

کا جمعہ بازار لگا تھا۔ ایک مسٹنڈا سامنے۔ دو سرا ساڈ

میں ادھر نظر جمائے نظر آئے۔ وہ اپنا کام کر کے بگٹ

اندر بھاگی۔ کمرے میں گھس کر سانس درست کرنے

لگی۔

آنے والے نے ایک اچھتی نظر ہی اس پر ڈالی

تھی۔ اتنا سامان؟ پھر دو مردوں کے بولنے کی آواز اور

سامان کی اٹھان۔ اور پھر۔۔۔ سچ مچ قیامت آگئی۔ صور

اس سے سر پھاڑ دیا کرتی ہوں، نہیں تو اتنے سال سے اکیلی کیسے رہتی۔ تیرے جیسوں سے پنپنے کے لیے۔ ارے ہٹ مرو۔

ہانپ رہی تھیں۔ وہ جھکا ہوا ان کی ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ اب آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ شاید اس کے آنسو خالہ بی کے پیروں پر گرے۔ کچھ نرم پڑیں۔
 ”اچھا۔ چھوڑ مجھے وہ سامنے والا کمرہ خالی ہے۔ اس میں اپنا یہ کباڑ لے جا کر رکھ۔“
 ”اماں! معافی۔ پہلے معاف کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

”اچھا۔ اچھا۔ چل ادھر۔ اتنے برسوں کی معافی۔ ایک دن میں نہیں ملا کرتی۔ سنا۔ اللہ کے آگے بھی ماتھا گھسنا۔ ناک رگڑنی ہوتی ہے۔ پھر اس کی مرضی۔“
 ”میں بھی ماتھا رگڑتا ہوں اماں! سچی۔ نماز پڑھتا اور غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔ بہت بڑی خطا کی تھی میں نے۔ بہت یاد آتی تھیں آپ۔ آپ کے ہاتھوں کا ہنا ہوا حلوہ اور کرارے برائے۔ اور۔ اچار۔ اب بھی بناتی ہیں؟ سچ صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ خوشی کے مارے کہ اماں کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔“

خالہ بی نے ہاتھ سے گویا مکھی اڑائی۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔ کمرے میں سامان رکھ دے۔ کھانا لائی ہوں۔“ وہ مڑیں۔ وہ مسکرایا۔
 ”اچھا۔ تو آپ کو امید تھی میرے آنے کی۔ تب ہی میرا کمرہ ابھی تک خالی ہے۔“

”سوچ رہی تھی اس کمرے کو کام میں لے آؤں۔ ایک کتا لا کر باندھ دوں۔“ سختی سے کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھیں۔

”مگر۔ اب ضرورت نہیں۔ ایک خچر آگیا ہے۔“
 پھر کچن کا ارادہ چھوڑ کر دوسری طرف چلیں اب ان کاٹاخ اصباح کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔ دروازہ کھول کر اسے گھورنے لگیں۔ ”یہ کیا حرکت تھی تمہاری؟“

وہ ڈر گئی۔ بہت غصہ تھا چہرے پر۔ ”کتنا ہی منع کرو۔ تم پر اثر نہیں ہوتا۔ کیوں کھولا دروازہ؟ جو ان

جہان دو دو مردوئے گھسالیے گھر میں۔“

”خالہ لی! وہ بہت زور سے دروازہ بجا رہے تھے۔ گھنٹی بھی۔ کہہ رہے تھے توڑ دوں گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ ضرار محی الدین ہیں۔ تو۔ ہاں۔ کہا حفصہ بیگم کا بیٹا۔ تو پھر۔“

”اچھا۔ کوئی کتا آکر بھونکے کہ میں حفصہ کا بیٹا ہوں تو۔ اگر جو وہ خبیث کرائے دار کا بیٹا یہ کہہ کر آجاتا گھر میں۔ قبضہ کر لیتا پورے گھر پر۔ پھر کہاں جاتیں تم اور کہاں جاتی ہیں۔“

”سوری خالہ بی! مگر۔ میں اتنی پاگل بھی نہیں ہوں۔ انہوں نے۔ پھر آپ کہتیں میرے بیٹے کو باہر کیوں کھڑا رکھا۔“

”وہ میرا بیٹا ہو۔ یا کالے چور کا۔ تمہیں کھولنا نہیں چاہیے تھا۔ نیند پوری ہوئی؟“

”میں بھی نہیں۔“
 ”خیر۔ کھانا پکا رکھا ہے۔ گرم کرو۔ بعد میں سو جانا۔ کھانا کھا کر۔“

نہ اس کا دل کھانے کو چاہ رہا تھا۔ نہ گرم کرنے کو، مگر نیند کا خیال دور بھگا کر کچن میں آگئی۔ واہ۔ قورمہ اور کٹھی وال خشک۔ ایک بولی تو اس نے گرم کرنے سے پہلے ہی منہ میں ڈال لی۔ ہر ادھنیا کٹا رکھا تھا۔ وہ دال اور قورمے میں ڈالنا تھا۔ ڈشوں میں نکال رہی تھی تو خالہ بی آگئیں۔

”میں لے جاتی ہوں۔ تم یہیں کھا لیتا۔ اچار لینے آئی ہوں۔ نامراد کو پہلے اچار کی طلب ہے اور اس کا چکھنا بھی چار پانچ پھاٹکوں کا۔ دو دن میں ختم کر دے گا۔“ لبوں پر دبا دبا تبسم بھی تھا۔ ماں آخر ماں ہی ہوتی ہے۔ سالوں سے امریکا کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ آتے ہی ماں کے قدموں پر گرا۔ پتا نہیں خالہ بی نے کتنا معاف کیا۔ اتنی آسانی سے تو معاف کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔

اس نے کچن سمیٹا۔ پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سلیب پر پلیٹ رکھ کر کھارہی تھی تو خالہ بی برتن رکھنے آئیں۔

”کھانا کھا کر نماز پڑھ لینا“ پھر سو جانا میں ذرا اچھی طرح اس کی خبر لوں۔ سارا قورمہ دال اور اچار چٹ کر گیا۔ نہ جانے امریکا میں فافے کر رہا تھا کیا؟ دو وقت کا کھانا تھا۔ سب ختم۔“

”برتن دھو کر کچن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھ کر بستر پر گری اور بے سدھ ہو گئی۔ شام کو آنکھ کھلی۔ سستی سی تھی۔ عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا جلدی سے ابھی نماز سے فارغ ہو کر کچن میں آئی۔ خالہ بی بریانی کی تیاری کر رہی تھیں۔ بیٹے کی خاطر داری۔ وہ چاول دھو رہی تھی تو جھائی لیتا بولتا ہوا آگیا۔

”کیا یک رہا ہے۔ اتنی خوشبو۔ اماں چائے مل جائے گی کڑک۔“ یک لخت ٹھنک گیا۔ اصباح پر نظر پڑی۔ سیٹی بجانے اور آنکھیں منکانے لگا۔

”واہ اماں! افوہ۔ نوکرائی تو بڑی شان دار رکھی ہوئی ہے۔“ کہیں سے لگتا نہ تھا کہ امریکا کی ہو اس کو گلی ہے۔ ایسی اردو۔ لہجہ بھی خالص۔

اصباح کو جلال چڑھا۔ اس نے خالہ بی کی پروا کیے بغیر کہا۔ ”شٹ اپ۔“

”اوس۔ انگلش جانتی ہے۔ واہ۔“ خالہ بی نے گرم کفگیر اس کے بازو پر لگایا۔ ”لی اے کر چکی ہے۔“ اچھل پڑا۔ گرم کفگیر بازو کو سخ کر رہا تھا۔

”اماں جی۔ اتنا ظلم تو نہ کرو۔ برسوں کے بعد بیٹا آیا ہے اس کو پیسے۔“ نگلی پھیر رہا تھا بازو پر۔

”جیسا کرو گے۔ ویسا پھل پاؤ گے۔ سن لو۔ پانچ برس بعد آئے ہو۔ یاد دس برس بعد۔ مجھ پر احسان نہیں ہے۔ شریفوں کی طرح زبان قابو میں رکھو۔ ورنہ۔ جہاں جی میں آئے چلے جاؤ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ خالہ بی صاف بات کرتی تھیں۔

”نہیں۔ میں۔ چلا جاؤں؟ آ۔ آپ یہ کہہ رہی ہیں۔ اس۔ اس نوکرائی کی خاطر۔“

اصباح کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ وہاں سے باہر آگئی۔ اب گرم چائے کا گلاس اس کے بازو کو مزید سینک رہا تھا۔ اچھل پڑا۔ غنیمت تھا کہ چائے گرم نہیں۔

”اور سن لو۔ پرانی لڑکی میری ذمے داری پر رہ رہی ہے۔ بیٹی ہے میری۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو انجام کے خود ذمے دار ہو گے۔“

”اماں۔ آتے ہی یہ سلوک۔ بیٹا ہوں۔“

”بھول چکی ہوں کہ میرا کوئی بیٹا تھا۔ آگئے ہو تو اپنا خون اور رشتہ ثابت کرو۔ نکلو یہاں سے۔ کمرے میں جاؤ۔“

جھاڑ کھا کر کمرے میں گھس گیا۔ اب وہ سوچ رہی تھیں اسے رہنے کی اجازت دے کر۔ غلطی تو نہیں کر دی۔ اصباح کی موجودگی۔ چھ سال میں عادات بدل جاتی ہیں۔ آزاد ماحول کی چکا چوند۔ آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔ اصباح نے خود حماقت کی۔ نہ کھولتی دروازہ، پانچ منٹ بعد میں آہی گئی تھی۔ ہرگز اندر آنے نہ دیتی۔ اصباح کا بندوبست کرنے کے بعد۔ بلاتی۔ اب کل کچھ کرنا پڑے گا۔

وہ ماں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔ اصباح پلیٹ میں بریانی لے کر کمرے میں آگئی۔ خالہ بی نے آکر کہا۔

”آج تم میرے کمرے میں سو جانا۔“ اکثر وہ اسے اپنے کمرے میں سلا لیتی تھیں۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔

”میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ کچھ پڑھنا ہو تو کتاب لے آنا۔“ مزید ہدایت۔ کتاب؟ اف، بمشکل تو جان چھوٹی ہے کتاب سے۔

وہ بھی نماز کی تیاری کرنے لگی۔ خالہ بی کی نماز کی چوکی برآمدے میں تھی۔ زیادہ سردی ہوئی تو اپنے کمرے میں چوکی رکھ لیتی تھیں۔ جب تک خالہ بی وضو کر کے چوکی تک پہنچیں اس کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ ان کے کمرے میں جانے کے لیے اپنا تکیہ اٹھا رہی تھی کہ ضرار نے اندر جھانکا۔

”کھانا کھا لیا تم نے؟ آؤ ذرا واک کرتے ہیں۔ پتا نہیں کیسے بھاری دل سے پکائی تھی۔ بہت بھاری پن ہو گیا بریانی سے۔“

”نہیں۔ وہ خالہ بی نے مجھے بلایا ہے۔ میں۔ خالہ بی نے دیکھ لیا تو مسٹر تم ہی بھگتو گے۔“

”وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ جب تک ہم واک کرتے

ہیں بھئی، مجھے کمپنی چاہیے۔ یہاں تو جگہ۔ کم ہے چلو۔ چھت پر ٹھنڈی ہوا ہوگی۔“

اسے دروازے میں جمادیکھ کر وہ رک گئی۔ ”نہیں جی۔ اوپر میں نہیں جاتی۔ میں واک نہیں کروں گی آپ جامیں۔“

وہ یک دم آگ بگولہ ہو گیا۔ ”کیسے نہیں کروگی۔ تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔ مجھے کوئی انکار کرے۔ میں برداشت نہیں کرتا۔ غصے سے بچو میرے۔ سنا۔ آؤ۔“ ہاتھ برہا رہا تھا اس نے جھانکا۔ خالہ بی نیت باندھ چکی تھیں۔

”دیکھیے۔ مجھے خالہ بی بلا گئی ہیں اور میں چھت پر نہیں جاتی۔“ نرمی سے کہا اور اگر اسے پھر غصہ آگیا نہ جانے کیا کرے گا۔

”آہا۔ اچھا۔ تو چلو۔ میرے کمرے میں سہی۔ بہت سارے تحفے لایا ہوں جو تمہیں اچھا لگے لے لیتا۔“

اندر آگیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ”نہیں۔ نہیں چاہیے کچھ۔“

وہ پھر غصے میں آگیا۔ اب اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ ”نہیں کیسے۔ تمہیں پتا ہے وہاں امریکا میں لڑکیاں میرے پیچھے پاگل تھیں۔“

”آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔ بُری بات ہے۔“

”کیسے چھوڑوں؟ امریکا میں کیسی کیسی لڑکیاں ہیرے جواہرات جیسی چمکتی دکتی چھوڑ آیا۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔ انکار کرتی ہو۔“ اس کی گرفت نے اصباح کو بے بس کر دیا۔ پھر بھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی، مگر وہ ہٹا کٹا۔ آخری کوشش۔

”خالہ بی۔ خالہ بی۔“ سٹی جیسی آواز حلق سے برآمد ہوئی۔ ضرار کو شاید اس کھینچا تانی میں لطف آ رہا تھا۔ وہ ہاتھ کھینچتے ہوئے پلنگ پر گر کر ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اصباح کو لگا اس کی آستین پھٹ گئی ہے۔ وہ

دوہری ہو کر طاقت لگا رہی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ پر کاٹنے کی بھی کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا۔ اصباح کا بازو تن ہو گیا تھا۔ پھر یکدم کھڑے ہو کر اس نے ایک لالت

اس کے پیٹ پر جمائی۔ وہ اٹھنے لگا تکلیف سے۔ اسی وقت خالہ بی اندر گھسیں۔ مدد آگئی تھی۔

”چھوڑ۔ چھوڑ اس کا ہاتھ، گھٹیا ذلیل انسان۔“

خالہ بی شیرنی کی طرح اس پر حملہ کر چکی تھیں۔ اصباح کو کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ ہاتھ چھڑا چکی تھی اور وہاں سے نکل کر بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی۔ اسے اس شخص کے درد میں ڈوبی ہائے سنائی دی، مگر رکنے کا موقع نہ تھا۔ گھبراہٹ میں دروازے کی چنجی بھی کھل نہیں رہی تھی، مگر کھل گئی۔

وہ گلی میں نکل آئی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ کھبے کا بلب تاریکی دور کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اس وقت اسے نہ اندھیرے سے ڈر لگانا نہ سناٹے سے۔ وہ ٹیمپ آئنی کے گھر کی گھنٹی بج رہی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا سا تھا۔ دروازہ ناجیہ نے کھولا۔ وہ اندر گھسی بلکہ تقریباً ”گر بڑی۔ آٹھ۔“ نے آکر اٹھایا اور ٹیمپ کو آواز دی اور اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اب آٹھ، ناجیہ، ٹیمپ کچھ کہہ رہی تھیں۔ پوچھ رہی تھیں۔ اصباح کا گلاب بند ہو گیا تھا۔

”اصباح باجی کہاں ہیں؟“ اسے ٹیمپ کی آواز سنائی دی وہ نڈھال وہیں پلنگ پر گر گئی۔ ناجیہ گلو کو زپانی میں ڈال کر لے آئی۔ پانی لی کر اوسان بحال ہوئے۔ ٹیمپ اس پر آیات پڑھ کر دم گر رہی تھیں۔ پھر اس نے کچھ انہیں بتایا مگر وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیا کہہ رہی ہے۔

ٹیمپ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ ایک آدی۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔ پھر۔ وہ بھاگی۔ آخر باجی کہاں تھیں۔ آدی کہاں سے آیا۔ وہ کون تھا؟

”ان۔ ان۔ خالہ جی کا بیٹا۔“

ٹیمپ کی چیخ نکل گئی۔ ”بیٹا۔؟“ پھر اطمینان سے بولیں۔ ”چلو۔ پھر وہ اس سے خود نمٹ لیں گی۔ بڑے بڑوں کو سیدھا کر چکی ہیں۔“

اصباح کی کپکپی رکی۔ تو حواس درست ہوئے۔ پھر اس نے آنسوؤں کو بننے دیا۔ بے بسی، بے چارگی۔

”بیٹا! اصباح کو قیص دے دو۔ اور تم لوگ سو جاؤ۔“

فکر نہیں کرو۔“

آٹھ نے اس کی پھٹی ہوئی آستین کو دیکھا جہاں مردانہ ہاتھ۔ طاقت ور ہاتھوں کی سخت گرفت کی سرخی بازو پر موجود تھی۔ تھر تھراتے ہاتھوں سے اصباح نے آٹھ کی قمیص پہنی اور پھر سے رونے لگی۔ کسی مرد کے ہاتھوں نے پہلی بار اس کے ہاتھ کو۔ اتنی طاقت ہوتی ہے؟ مرد میں۔

”اچھا اب رونا دھونا بند کرو۔ ابا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ ویسے بھی تم نے کھنٹی بجا کر اور اندر جو ہم نے شور کیا۔ وہ تو شکر ہے ابا اٹھے نہیں۔ پریشان ہو جاتے۔ بڑے بھائی، بھابھی تو اوپر کے پورشن میں رہتے ہیں۔ شاید زاہد دادا کے کمرے میں ان تینوں کی نیند۔ ڈھول بجانے سے کم میں نہیں کھلتی۔ مگر ابا۔“

اصباح نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”سوری آٹھ۔ میں۔ ڈری ہوئی تھی۔“

چند منٹ بعد۔ خالہ بی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ شینہ منتظر تھیں۔

”اصباح آگئی؟“ یوں جیسے معمول کی بات ہو۔

”باجی۔ ہوا کیا ہے؟“ شینہ بے چینی سے پوچھنے لگیں پر کسی سے ہمدردی میں کوئی نقصان نہ کر بیٹھیں۔

”بتاؤں گی، مگر ابھی تو مجھے جانا ہے۔ آؤں تو دروازہ کون کھولے گا۔ شاید دیر ہو جائے۔“

شینہ نے تسلی دی۔ ”میں کھولوں گی۔“ پوچھ نہ سکیں۔ کہاں جانا ہے۔ بیٹا کہاں ہے؟

”اپنا گھر۔ بند کر کے۔ اچھی طرح سے بند کر دیا ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ہاں۔ ابھی تو اس بے ایمان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑا ہے۔ کمرے لاک ہیں۔ اچھا اصباح کو تسلی دینا۔ میں بھی یہیں رہوں گی آج۔“ باہر سے کسی نے پکارا۔

”آئی! جلدی کریں۔“

شینہ حیران۔ یہ تو ان کے کرائے دار کے بیٹے کی آواز ہے۔ نہ جانے کیا کر رہی ہیں اور کرائے دار کے

بیٹے کے ساتھ کہاں جا رہی ہیں۔ ہیں؟ ایسبولینس کی آواز۔ اللہ خیر کرے۔ کچھ دیر پہلے بھی ایسبولینس کا ہارن سنائی دیا تھا۔ اس وقت وہ اصباح کے پاس تھیں۔ عورت نہیں کیا۔ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئیں۔ جاگنے کا بہانہ، جب تک باجی آنے جاتیں۔ انتظار آف۔ نہ جانے کس پڑوسی کو اسپتال لے گئی ہیں، حفصہ بیگم تنہا سخت زندگی گزار رہی تھیں۔ تنہائی کے تدارک کے لیے کرائے دار رکھ لیے، لیکن وہاں بھی دھوکا ہوا۔

بدرجہ مجبوری اصباح کی ذمہ داری اٹھائی۔ ان سے زیادہ قریبی رشتے دار کوئی نہ تھا۔ اس کے چچا تھے، مگر وہ بھی مصباح کو شاید غیر یاغاصب سمجھ کر اس بٹی کو اپنا نہ سکے یا پھر جوان بھتیجیوں کی حمایت۔ حفصہ کے لیے مشکل فیصلہ تھا، لیکن حق ان ہی کا تھا۔ یوں بھی مصباح اپنے حصے سے دستبرداری اختیار کر کے حفصہ کو مالک بنا چکی تھی۔ اس کا احسان۔ پھر اصباح کو گھر کا حصہ دینے کا ارادہ کر کے۔ بچی کی شیمی اور بے سہارا پن۔ ماں باپ سے محروم۔ باپ کے گھر سے بے دخلی۔ ان کا دل بچی کے لیے تڑپ گیا، لیکن دنیا کی بے ثباتی۔ خود غرضی اور ریا کاری سے خوف زدہ۔ اس پر پابندیاں لگا دیں۔ وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ دوستوں سیلیوں کو بلانا منع۔ زور سے بولنا، زور سے ہنسا، رشتے داروں سے ملنے کے لیے بھی خالہ بی کا وجود ضروری۔ وغیرہ۔

کرائے دار کے لڑکے سے خوف زدہ، یہ نہیں جانتی تھیں کہ بیٹا بھی راہزن ہو گا۔ اس دن ہزار بدایتیں دے کر کھانا تیار کر کے وہ واجد بھائی سے ملنے گئی تھیں۔ لڑ بھڑ کر آئیں۔ ان کا بیٹا سامنے نہیں آیا۔ یا وہ تھا ہی نہیں۔ گھر آ کر دیکھا۔ اپنا بیٹا موجود۔ معہ سامان۔ لاکھ خفگی سہی۔ ماں کا دل گداز جذبوں سے لبریز، مگر وہ گھٹنے بعد ہی سوچنے لگیں۔ امریکا کے تنگ دھڑنگ ماحول میں چھ سال گزار کر آنے والا۔ نہ جانے کس قماش کا ہو گا۔ بگڑنے میں پل نہیں لگا۔ سدھرنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔

اور ان کا دوسو سو، وہم سچا تھا۔ رات ابھی گزری نہ

تھی۔ واردات ہو گزری۔ اصباح کی چیخ نماز کے دوران سنی۔ بغیر دیکھے سمجھ گئیں۔ ڈنڈا پر آمدے میں رکھا رہتا تھا۔ اٹھا کر درانہ کمرے میں گھس گئیں۔ چھوڑ۔ چھوڑ اس کا ہاتھ۔ مضبوط تو اتنا مرد۔ ماں کی آواز کی کیا پروا کرتا۔ اصباح جدوجہد کے دوران زوردار لالت اس کے پیٹ کے پچلے حصے میں مار چکی تھی۔ اس کا غصہ اور تکلیف۔ ضد ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں لائے بغیر لڑکی کو کھینچا۔ اور ماں نے ڈنڈا رسید کیا پیروں پر لگا۔ وہ ذرا سر جھکا کر اٹھنے لگا کہ دوسرا ڈنڈا۔ عین سر پر۔ اصباح ہاتھ چھڑا کر بھاگ چکی تھی۔

حفصہ بیگم کو اپنی طاقت کا پہلی بار احساس ہوا۔ جب بیٹا چیخ کر دہرا ہوا اور پلنگ سے لڑھک کر نیچے گر آئیں سر سے خون بہا۔ چہرہ تر ہوتا گیا۔ ”کیا سمجھتا ہے۔ میں اتنی کمزور ہوں۔ جان لے سکتی ہوں۔ عزت کے عوض۔“ ان کا سانس تیز ہو رہا تھا۔ ”بد بخت۔“

کیڑے کی طرح سر تھامے زمین پر سکڑا پڑا تھا۔ طاقت اتنی بھی تو نہیں۔ پھر یہ کہاں سے آئی۔ شاید۔ اس ذمے داری کے احساس نے۔ جو وہ اصباح کے لیے دل میں رکھتی تھیں۔ بے پناہ محبت۔ مامتا۔ ممنونیت۔ جو اس کی ماں نے ان پر احسان کیا تھا۔ جب وہ بے سہارا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ یک لخت انہیں بیٹے کا خیال آیا۔ یہ بہتا ہوا خون۔ کس کا تھا۔ ان کا اپنا۔ ماں کے دودھ سے کشید کیا ہوا خون۔

وہ ڈنڈے سمیت صحن میں دوڑیں۔ درمیان کی دیوار میں کھڑکی جو عرصہ دراز سے بند تھی۔ زور زور سے ڈنڈے سے بجائی۔ کبھی سوچا نہ تھا۔ یہ کھڑکی اس لیے بنائی ہے کہ کبھی اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ اس قسم کی مدد کے لیے۔ کھڑکی کھل گئی۔ حیران پریشان کرائے دار کا بیٹا۔ جسے مردود۔ مستنڈا کہتی تھیں۔

”جی۔ جی۔ خیریت۔“ کہتا ہوا۔ ”تمہارے پاس فون ہے؟ ذرا یہ قریب والے اسپتال فون تو کرو۔ ایسبوالینس منگوالو۔“ ”خے۔ خے۔ خیریت۔ تو ہے۔ خا۔ خالہ جی۔“

حواس باختہ ہو گیا۔

”اوہو۔ تم تو ہکلمے ہو۔ گھنٹہ لگا دو گے۔ نمبر ملا کر مجھے دو ذرا۔“ وہ ہکلتا نہ تھا، مگر ”دشمن خالہ“ کے بے وقت درشن اور خطرناک فرمائش۔ بجلی کٹا دی۔ پانی کٹا دیا۔ مقدمہ کر دیا اور اب۔۔۔ جلدی سے نمبر ملا کر انہیں موبائل دیا۔ انہوں نے ایسبوالینس طلب کی۔ ایڈریس بتایا۔ فون واپس کر دیا۔

”جج جی خالہ جی۔ کون مریض ہے؟“ خالہ جی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی اپنے صحن میں ہی کھڑا تھا۔ اجازت ملتے ہی خالہ جی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اندر کا سین بہت خوف ناک تھا۔ چیخ نکل گئی۔ ”آ۔ آپ نے قتل کر دیا۔“

”نہیں بھئی۔ ڈنڈا مارا تھا۔ میرا بیٹا ہے۔ آج امریکا سے آیا ہے۔“ حیران لڑکے نے آگے آکر ضرار کو دیکھا۔ فرش پر خون پھیل رہا تھا۔ ”آپ نے سر پھاڑ دیا بیٹے کا۔“

”ہاں۔ غلط جگہ لگ گیا۔“ ”مگر۔ خالہ جی۔ اس طرح تو ڈاکو کو ہی۔“ ایسبوالینس آگئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لڑکا ایسبوالینس والوں کو راستہ بتانے باہر گیا۔ کھڑکی میں نوید صاحب لڑکے کے ابا جان سوالیہ نشان بنے کھڑے تھے۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے۔“ ”تماشا ہو رہا ہے۔ آئیے۔ آپ بھی نظارہ کر لیں۔“

اور وہ آگئے۔ ضرار کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ ”یہ۔ یہ تو آج صبح۔ میں نے دیکھا تھا۔ ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔“

”اچھا سنیں۔ میں اس کے ساتھ اسپتال جا رہی ہوں۔ آپ کھڑکی کھولے رکھیں پورا گھر آپ کے حوالے میں شاید صبح آوں۔“

وہ حیرت سے اس عورت کی مضبوط قوت ارادی اور قائم ہوش حواس دیکھ رہے تھے۔ کمروں میں لاک لگا رہی تھیں۔ اس حال میں بھی۔

بھابھی کے ہتھکڑی لگے دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ تمہیں انعام بھی دے گا۔“

”کک کون۔ آئی جی یعنی کہ۔“

”یعنی کہ میرا دیور نثار حسین۔ اس لڑکے۔ یعنی کہ زخمی کا سگا چچا۔“ سنتے ہی ڈاکٹر فوجگر ہو گیا۔ زخمی کی دیکھ بھال۔ مرہم پٹی اس پر فرض تھی۔ زخمی کے پٹی ہو گئی۔ انجکشن لگ گیا۔ ڈرپ لگادی گئی۔ زخم بہت گہرا نہ تھا، مگر خون کافی بہہ گیا تھا۔

”اب میں گھر جاؤں؟ یا پولیس آئے گی؟“ مطمئن ہو گئی تھیں۔

”آپ۔ واقعی اس کی ماں ہیں؟ اس کے پاس رہیں گی نہیں؟“ ڈاکٹر مشکوک تھا۔

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اس کو تمہارے پاس تمہاری ذمہ داری پر چھوڑ کر جاؤں گی۔ سن لو۔ آئندہ بھی ایسا ممکن ہے۔ میں شرمندہ نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر ان کے رعب میں آگیا۔ ڈکٹیٹر۔ ضرار کو ہوش آگیا تھا۔ اماں کہہ کر بیٹھے لگا۔ نرس نے پھر لٹا دیا۔ انہوں نے اس کے پٹی میں بندھے سر کو دیکھا۔ نہ جانے کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی۔ دل دکھ سے بھر گیا۔

”اب میں گھر جا رہی ہوں۔“ بیٹے کے سر پر پٹی کو نری سے چھوا۔ آنسو حلق کے اندر اترے۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں لجاجت کے پیغام ارسال کیے۔

”رک نہیں سکتی۔ یہاں یہ نرسیں ہیں۔ ڈاکٹر ہے۔ تمہاری دیکھ بھال کر لیں گے۔ صبح آؤں گی۔ ناشتالے کر۔“

اپستال کے گیٹ پر کرائے دار کا بیٹا کھڑا تھا۔ متفکر سا۔ (پولیس دیکھ کر دوڑ لگا دوں گا۔ سوچ لیا تھا۔)

”ٹیکسی روک لو۔“ آرڈر ملا۔

”سب ٹھیک تو ہے جی۔۔۔“ گھبرائے ہوئے کرائے دار نے پوچھا۔ جواب ”ہوں“ میں ملا۔ ٹیکسی میں گھر آئیں۔

”سنو! اے لڑکے کیا نام ایسا کرو اپنے گھر کے دروازے سے اندر جاؤ۔ کھڑکی کے راستے میرے گھر کے برآمدے میں سو جانا اور ہاں۔ ٹن گیٹ۔ یہ وال

”دروازے اندر سے بند کر لیں۔“ دو آدمی ضرار کو اسٹریچر پر لے جا چکے تھے۔ حواس قائم رکھنا ان کی مجبوری تھی گھر جو دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔ ڈوری سے تولیہ بھی کھینچ لیا۔ پھر باہر نکل کر ٹینہ کا دروازہ۔ وہاں سے۔ آکر لڑکے سے کہا۔

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“ وہ بدک گیا۔ پہلا شک تو یہی تھا کہ اسے کہیں قتل کا ذمہ دار نہ ٹھہرا دیں۔

”جی۔ یہ تو پولیس کیس ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”اوہو۔ تم اپستال کے دروازے پر کھڑے رہنا۔ میں رات میں اکیلی واپس کیسے آؤں گی۔ چلو۔“

ادھر ایسولینس والے نے جلدی مچائی۔ مریض بے ہوش ہو گیا۔ ضرار کے ساتھ بیٹھ کر اسے دیکھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ تولیے سے چہرہ صاف کرتی گئیں۔ آنسو بہائی گئیں۔ یہ وہی چہرہ ہے جس کو دیکھ دیکھ کر زندگی کی دعا مانگا کرتی تھیں۔ اس کے گھنے بالوں میں منہ گھسا کر لوریاں دیتی تھیں۔ بچپن سے نوجوانی تک کے کتنے ہی سین فلم کی طرح سامنے سے گزر رہے تھے مگر اپستال آگیا تھا۔ ایمر جنسی میں ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہہ دیا۔

”یہ تو سرا سرا اقدام قتل کا کیس ہے۔“

”چھا! پھر بلا پولیس کو۔ لگا دو ماں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ میں نے سرزنش کے لیے ذرا سا ڈنڈا گھمایا۔ بس آج کل کی نازک اولاد۔“

”سچ بتائیں۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ سگی اولاد۔ آپ نے خود اس کو زخم لگایا ہے۔ کوئی اور۔“

”کوئی اور میرے بیٹے کو ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ سر نہ پھاڑوں گی اس کا۔ پھر بد تمیزی کرے گا یہ۔ تو پھر پٹے گا۔“

”آپ تو۔ لگتا ہے۔ عادی ہیں۔ میں مجبوراً“

پولیس سے رابطہ۔ ڈاکٹر ان کو سمجھ نہ سکا۔

”چھا بھئی۔ پہلے زخمی کا حال دیکھ لو۔ پھر بے شک پولیس بلا کر میرے ہتھکڑی لگانا اور اس سے پہلے ذرا مجھے اپنا فون دو۔ میں یہاں کے آئی جی کو بلا لوں۔ بڑی

(اشارہ کیا) اندر سے چٹختی کھول دینا۔ میں باہر سے لاک کر کے جارہی ہوں۔ صبح سویرے آؤں گی خود ہی کھول کر۔ ناشتا بنا کر اسپتال لے جاتا ہے۔ ”وہ گردن ہلاتا رہا۔“

کیا مجبوری ہے۔ کبھی تو کو چوکیداری سونپ دی۔ کل تک جن کو عاصب، بے ایمان، قبضہ گروپ کہہ کر بدنام کرتی تھیں۔ مرد کا سہارا بھی ضروری ہے۔ ایک اپنا بیٹا ہے۔ دوسروں کو الزام دینے کا یہ صلہ ملا کہ اپنا بیٹا ہی ڈاکو بن گیا۔

ثمینہ نے پہلی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ ہمدرد ہستی۔ فکر مند چہرہ۔ ان کی برداشت جواب دے گئی۔ ثمینہ کے گلے لگ کر لڑکھڑا گئیں۔ ثمینہ گھبرا گئیں۔ سہارا دے کر اندر لائیں۔ نی وی بند کیا۔ ساتھ لپٹ کر بیٹھیں۔ وہ بھی اپنا دکھ آنسوؤں کی زبان میں بیان کرنے لگیں۔ ثمینہ نے پانی پلایا پیٹھ سہلائی۔

رات کا سناٹا۔ ماں کی درو بھری نغلاں۔ ثمینہ کا دل بھر آیا۔ نہ جانے کیا ہوا ہے جو باجی جیسی مضبوط چٹان میں دراڑ پڑ گئی۔ آنسوؤں کی برسات پہلی بار دیکھی تھی۔

”باجی! دل سنبھالیں۔ مجھے بتائیں ہوا کیا ہے۔“
اولاد کا جرم۔ اپنی سنگدلی۔ مجبوری کی داستان کن الفاظ میں سنائیں، لیکن بوجھ ہلکا نہ کیا تو۔ آہستہ آہستہ سنائی چلی گئیں۔

جی۔ کھری مضبوط ایمان کی مالک عورت۔ ماں بعد میں تھی۔ فرض شناس عورت پہلے۔ ثمینہ تاسف میں گھر گئیں۔ کیا قسمت ہے اس عورت کی۔ تنہا عمر گزار دی شوہر دعا دے گیا۔ بیٹے نے آتے ہی یہ گل کھلائے۔ ان کا بیٹا بھی کئی سال بعد آیا تھا۔ شادی کر کے اب میاں بیوی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا بیٹا پہلے دن ہی اسپتال پہنچ گیا۔ ماں کے ہاتھوں۔ خدایا رحم کر۔ ”ہوش میں تو تھا۔؟“

”ہاں۔ اس کی فکر نہیں ہے، مگر جو کرائے داروں کے سپرد کر کے آئی ہوں۔“

”یہ کیا غضب کیا آپ نے۔“

”ثمینہ! اس گھر میں جانے کو دل نہ چاہا۔ کمرے میں اس کا خون۔“ سر جھکا لیا۔ آنسو ٹپکنے لگے۔ پھر سر اٹھا کر پوچھنے لگیں۔ ”اصباح۔ ٹھیک ہے؟“

”جی۔ پہلے روتی رہی۔ پھر آٹھ منے بہلا لیا۔ سو گئی ہیں دونوں۔“

”اچھا۔ یہ وقت بھی آتا تھا۔“ ”سرد آہ۔“ جس بڑے وقت سے بچانے کے لیے اسے پردوں میں چھپا کر رکھتی تھی۔ یہ خبر نہ تھی۔ میری ہی اولاد۔ ”آواز گلے میں پھنس گئی۔“

ثمینہ نے تسلی دی۔ ”چلیں جانے دیں۔ اللہ مالک ہے۔ آپ آرام کریں۔ فکر نہ کریں۔“ وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئیں۔

ثمینہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ تاسف۔ عورت کے نصیبوں کے سارے کھیل ہیں اور اب۔ اس بچی کی حفاظت کا مسئلہ۔ نہ جانے کیسے رشتے دار ہیں۔ بچی کو درمیان میں لٹکایا ہوا ہے۔ اللہ اس کے لیے بہتر راہ نکالے۔ وہ تو سو گئیں۔

حفصہ بیگم کی نیند اڑ گئی۔ لاؤنج سے متصل ایک چھوٹا واش روم تھا۔ وہاں جا کر وضو کیا اور تہجد ادا کرنے لگیں۔ دعائیں اور وظیفے۔ پھر فجر ہوئی گئی۔ دروازے کھلنے کی آواز۔ ثمینہ کے میاں مسجد جا رہے تھے۔ شاہد زاہد کو بھی جگا کر لے جاتے تھے۔ کتنا اچھا ماحول ہے۔ امن، محبت، سیدھا سادہ گھرانہ، ہمدرد لوگ، ایک

میں ہوں فکر میں مبتلا۔ اطمینان نصیب ہی نہیں۔ اصباح کی طرف سے ہی کم فکر نہ تھی کہ بیٹے نے پریشان کر دیا۔ بیٹا کسی قابل ہوتا۔ اصباح کی اب بھی اس سے ہو سکتی تھی۔ خلع کے بعد واجد بھائی نے اطمینان نہیں دلایا نہ مایوس کیا۔ عجیب مبہم سا جواب دیا۔ بھئی آپ کا بیٹا انکار کر رہا ہے۔ تو پھر اس سے طلاق کا کہیں۔ بچی کو فارغ کریں۔ ابھی تو۔ اعزاز، افراز اور اتنی معصوم پیاری بچی ہر کسی کی پسند ہوتی ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے۔ فی الحال تو گھر کی فکر کم نہیں تھی۔ نہ جانے۔ ضد میں وہ لڑکا اندر گھسا کیا توڑ پھوڑ کر رہا ہو گا اور ضرر اسے پتا نہیں رات کیسی گزری ہوگی۔

زخم میں ٹانگے لگے ہیں۔ تکلیف تو ہوگی۔ آٹمہ الماری سے قرآن شریف لینے آئی۔ ٹھٹک گئی۔
 ”ارے۔ آپ جاگ گئیں۔ امی سمجھ رہی تھیں آپ سو رہی ہوں گی۔ میں چائے لاتی ہوں۔“

”چائے بعد میں لے آنا۔ قرآن شریف پڑھ لو۔“
 ”میں چائے بنا رہی ہوں۔ ابو آتے ہوں گے۔ امی بھی جاگ رہی ہیں۔ قرآن میں بعد میں پڑھ لوں گی۔ ابھی تو اصباح نے مانگا ہے۔ اس کے لیے لینے آئی تھی۔“

وہ قرآن پاک لے کر چلی گئی۔ وہ بھی صوفے پر لیٹ گئیں۔ جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ دل بے چین۔ کچھ دیر بعد شاہد زاہد کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر آٹمہ چائے لے آئی۔ اصباح بھی وہیں آگئی۔ خالہ بی نے بازو پھیلا دیے۔ وہ سا گئی۔ کیسا سکون ملا۔ رات بھر میں خون چڑ گیا تھا جیسے۔ ہا۔ کچی کیسی خوف زدہ تھی۔
 ”ہم گھر کب چلیں گے۔“ وہ جانتی نہ تھی خالہ بی کیا کارنامہ انجام دے چکی ہیں۔

”تم ابھی بیس رہو۔ میں جاؤں گی۔“
 ”خالہ بی۔ آپ بھی رکیں۔ ناشتا کر کے جائے گا۔“ آٹمہ نے محبت سے کہا۔

”مجھے اسپتال جانا ہے ناشتا لے کر۔ خود بھی کر لوں گی۔“ لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ”اسپتال۔؟“

”ہاں۔ ضرار وہیں ہے۔“ انہوں نے اختصار سے کام لیا۔ لڑکیوں نے نظروں کا تبادلہ کیا۔ چائے ختم کر کے اپنا برس اٹھا کر چلی گئیں۔

گھر کا لاگ کھول کر اندر آئیں۔ کرائے دار لڑکا برآمدے میں نماز کی چوکی پر سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ سرہانے اس نے کرسی رکھ لی تھی۔ اس پر ایک چادر کو تہہ کر کے گویا تکیہ بنالیا تھا۔ ”ہئے ہئے بے چارا اور میں سمجھ رہی تھی توڑ پھوڑ کر رہا ہوگا۔ گھامڑ کہیں کا۔ اپنے گھر سے بستر ہی لے آنا۔ بھلا مانس ہے۔“

فورا ”خیال بدل گیا۔ کھٹ پٹ کی آواز سے جاگ گیا۔ خالہ بی کو دیکھ کر اوہ کر کے بولا۔

”آپ اتنے سویرے جاگ گئیں۔“
 ”بس بیٹا۔“ (ہائے۔ کیا وقت پڑا تھا جس کا نام ہی سنڈا مسٹنڈا رکھ چھوڑا تھا۔ آج بے اختیار بیٹا کہہ دیا۔ خود ہی شرمسار ہو گئیں)

”نیند آئی ہی نہیں۔ اسپتال ناشتا بھی لے کر جانا ہے۔ میں تمہارا ناشتا بھی بنا رہی ہوں۔ آلیٹ کھاؤ گے۔ پرائٹھے بھی بنا رہی ہوں۔“

لڑکا جھینپ گیا۔ (لڑکا آئی۔ اتنی مہربان)۔
 ”نہیں۔ میں گھر پر کر لوں گا۔ آپ کو زحمت ہوگی۔“
 ”تم نے بھی اتنی تکلیف اٹھائی۔ گھر سے بستر لے کر آتے۔ معاف کرنا۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ تمہیں بتاتی۔ پیچھے گیلری میں پلنگ بھی کھڑا ہے۔ میرے ساتھ کر لو ناشتا۔“

ہائے رے غرض۔ کل تک جو دشمن تھے۔ آج انہیں ہی دوست بنانا پڑا اور جو اپنا بیٹا ہے۔ وہ؟

”نہیں خالہ جی! شکریہ۔ دراصل مجھے بھی دیر سے نیند آئی۔ آپ کے بیٹے کی فکر تھی۔ آپ رک جاتیں یا مجھے کہتیں نہیں رک جاتا۔ اصل میں۔ میں تو ڈر رہا تھا۔ پولیس مجھے ہی نہ دھر لے۔“

”ہاں۔ کہتے تو یہی تھے کہ یہ پولیس کیس ہے۔“
 جلدی جلدی اندھا پھینٹ رہی تھیں۔

”میں نے کہا۔ ٹھیک ہے لگا دو میرے ہتھکڑی۔ پہلے مجھے آئی جی نثار حسین سے بات کرنے دو۔ وہ اپنی بڑی بھابھی کو ہتھکڑی میں دیکھ کر تمہیں انعام دیں گے۔ بس ڈر گئے۔“

”کیا واقعی۔ آپ آئی جی کی بھابھی ہیں۔“ (حیرت پھر ہمارے معاملے میں ان سے مدد کیوں نہ لی۔)

”لو۔ میں کیا جانوں آئی جی لگوڑے کو۔ اخبار میں کہیں پڑھا تھا۔ تڑی لگا دی۔“

”(ہاں جی۔ اس کی تو ماہر ہیں۔)“ ”چھا خالہ میں چلتا ہوں۔“

”ارے کر لیتے ناشتہ۔ ویسے شکریہ۔ رات کو ساتھ جانے کا۔ اور گھر کی چوکیداری کا۔“

(چوکیداری؟ جربز ہوا۔) ”ابھی تو گھر جا کر سوؤں

گا۔ ”کہہ کر کھڑکی سے اپنے گھر میں کود گیا۔

کھڑکی بند۔ چلو۔ بزرگ کہہ گئے ہیں وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ شاید یہی وقت تھا۔ اسپتال میں صبح بڑی ہلچل ہوتی ہے۔ ناشتے۔ نرسوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ کنٹین کے پیرے ادھر سے ادھر ناشتے لیے پھر رہے تھے۔ ”ضرار جاگ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر آنکھیں جھکنے لگیں۔ اس ناشتہ کرایا۔ ”رات کو۔ نیند آگئی تھی؟ کوئی درد وغیرہ۔“

ضرار منہ پھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ”خود ہی ڈنڈا مارا۔ اب پوچھتی ہیں۔“

”مرد بنو۔ کیا ہو گیا۔ راسھے بنا کر لائی ہوں ویسی گھی کے۔ پیر والا آلیسٹ۔ کیسا ہے؟“ بسلا رہی تھیں اسے۔

وہ آنکھوں میں آنسو بھرے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھ پکڑ کے چومنے لگا۔ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ضبط کے باوجود آنکھیں بھر آئیں۔ ہائے؟ ماں کا دل۔ اور کیا رات کو ماں کا دل نہ تھا؟ قصائی بن گئیں۔

نرس ٹھنک گئی۔ ”آپ سگی ماں ہیں؟ یقین نہیں آتا۔“ ٹھنک ٹھنک کرتی چلی گئی۔ اپنے گھر جانے کے بجائے رفیعہ کے گھر چلی گئیں۔ کچھ مشورہ کرنا تھا۔ رفیعہ ان کی بات سن کر دنگ رہ گئیں۔

”یعنی۔ واجد بھائی بھی انکاری ہو گئے۔ مجبوراً۔“ ”بالکل انکار نہیں کیا۔ گوگو میں تھے لڑکا مانتا نہیں۔ کوشش کرنے کا کہا ہے۔“

”سیدھی طرح طلاق دے دیں۔ بات ختم۔ مگر مہر کے معاملے میں۔ جان اٹکتی ہے۔ واجد بھائی شریعت کے پابند ہیں۔ شاید مہر تو دلوادیں گے۔ ورنہ اللہ کا عذاب کون برداشت کرے گا۔ کیلین آیا، آپ لڑکے سے ملیں تو سہی۔ ایک بار وہ اصباح سے مل تو لے۔ پتا نہیں کبھی دیکھا بھی ہے۔“

”اب یہ بتاؤ۔ کب تک انتظار کروں ان کی کوشش کا۔ خلع کانولس بھجوا دوں۔“

”اگر۔۔۔ مان جائیں تو۔ میں تو اس کی گلو خلاصی

ہوتے ہی بہونا کر لے آؤں گی۔“

”رفیعہ! مگر چھ سال سے نکاح کا کچھ اثر تو ہو گا۔ ذکر پر رنگ آڑ جاتا ہے اصباح کا۔ کھانا تو اس نے بھی نہیں ہے مگر۔ تعلق تو ہوتا ہے۔ لڑکے نے ملنے یاد دیکھنے کی شرط رکھی نہیں۔ ورنہ کیا رکاوٹ ہے۔ اصل میں کسی اور لڑکی سے دل لگالیا ہے۔“

”تو آپ طلاق کا مطالبہ کریں اصباح کو سمجھا دیں۔ یا انتظار کریں۔“

”رفیعہ۔! اصل میں اب میرے پاس انتظار کا وقت بھی نہیں ہے۔ کل۔“

سوچ سمجھ کر مناسب الفاظ میں پورا واقعہ سنایا۔ اپنا کارنامہ۔ رفیعہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ منہ فق۔ حیرت۔ تاسف۔

”اب وہ اسپتال سے آئے گا۔ پتا نہیں کیا کرے گا۔ بدطنہیت ہے تو بدلہ تولے گا ہی۔ اصباح کو کہاں چھپاؤں۔ تمہیں اپنا سمجھ کر بتا رہی ہوں۔ کبوں کیا؟“ ”آپا! ویسے تو میرا گھر حاضر ہے۔ مگر یہ کوئی حل تو نہیں ہے۔ آپ واجد بھائی پر دباؤ ڈالیں۔ اگر۔ ضرار کے آنے پر اصباح کا تعارف کرا دیتیں۔ وہ اتنی ہمت نہ کرتا۔ ظاہر ہے امریکہ کے ماحول کا عادی۔ ابھی یہاں کے طور طریقے سمجھنے میں کچھ عرصے تو لگے گا۔ اس پر بھروسہ کریں۔ آپ کا بیٹا ہے۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا بیچ بیچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کیسے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا بیچ بیچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کیسے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا بیچ بیچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کیسے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا بیچ بیچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کیسے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”بھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا بیچ بیچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسہ ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آکر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کیسے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ رخصتی کب کر رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔“

”ٹھیک ہے۔ صبح کو آج ہی لے آئیں۔
امتحانوں سے فارغ ہو کر لڑکیاں ملنے ملانے جاتی ہی
ہیں۔ افراز تو اسلام آباد میں ہے۔ ٹرانسفر ہو گیا ہے۔
اعزاز صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ اجیہ کے ساتھ صبح کا
دل لگا رہے گا۔ ثریا بھی آنے والی ہے۔“

صبح کو رفیعہ کے گھر سے قدرتی لگاؤ تھا۔ ان کے
برابر میں ہی تو اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنا گھر۔ جہاں نہ جانے
اب کون رہتا ہے مگر۔ اس کے بچپن کی یادیں۔ اس گھر
سے وابستہ تھیں۔ خالہ بی نے چاہا کہ وہ اپنے کچھ
کپڑے ضرورت کا سامان لے کر آئے۔ پھر مناسب نہ
سمجھا۔ کمرے میں ضرار کا خون۔ بستر پر خون۔ وہ خود
اپنے گھر سے نظر چارہ ہی تھیں۔ کمرے کی حالت کا
سوچ کر ماما کا خون ہوتا محسوس ہوتا۔

نہینہ اپنی ملازمہ کو ساتھ لے کر خود گئیں۔ کمرہ
دھلوا دیا۔ بستر تبدیل کیا۔ خالہ بی نے لڑکی کو انعام کہہ کر
سوروپے دیے۔ بہت شرمائی۔ آپٹل دانٹوں میں دبا کر
نوٹ پکڑ کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

”اس کی تو عید ہو گئی۔“ آئمہ نے بتایا۔ ”ماں آکر
تنخواہ لے جاتی ہے۔ اس کو دو روپے مکئی کے دانوں کے
دیتی ہے۔ کبھی دس روپے نہیں دیے، آئس کریم کے
لیے۔“

صبح مگر گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اگر اسپتال
سے اچانک آجائے۔ اسے دیکھ کر پھر غصہ آجائے۔
پیٹ میں لات ماری تھی۔ بھولا تو نہیں ہو گا۔ خالہ بی
خود ہی جا کر کپڑے لے آئیں۔ صبح کو رفیعہ کے گھر
پہنچا دیا۔ وہاں سے اسپتال گئیں۔

”ماں! ڈاکٹر سے کہو۔ مجھے آج ہی چھٹی دے
دیں۔ دل گھبراتا ہے بہت۔“ بلجانت سے کہا تھا۔

”کیوں؟ دل کیوں گھبراتا ہے؟ نرسیں دل نہیں
بہلاتیں؟“ طنزاً ”کہا۔“ ”چھا خیر۔ شام کو رقم ملاؤں گی تو
چھٹی کروادوں گی۔ ابھی تو اندازہ نہیں مل کتنا ہو گا۔“

”کمرے میں میرا نیلا بیگ الماری میں رکھا ہے۔
اسی میں رقم ہے۔“ گردن جھکالی۔

”اب گئیں۔“ اللہ وہ دن نہ لائے۔ جو میں تم سے

رقم لوں۔ تم نے جب کبھی ڈالر بھیج دیا وہ بینک کے لا کر
میں رکھے ہیں۔ لے لینا وہ بھی تم۔ میں کسی سے
ادھار کر لوں گی۔“

بیٹے کو مایوس اور حیران کر کے آگئیں رفیعہ کے ہاں
صبح کا حال پوچھنے اور رفیعہ سے معلوم کرنا تھا۔
سعیدہ کے فون کا۔ انہوں نے اپنے کمرے میں لے
جا کر سرگوشی میں بتایا۔

”سعیدہ خود پریشان ہیں۔ لڑکا راضی نہیں۔ اصل
میں یہاں کوئی لڑکی اسے بہت پسند آگئی ہے۔ کتا
ہے۔ آپ اس لڑکی کو دیکھ لیں۔ پھر فیصلہ کریں۔ اگر
آپ کو پسند نہ آئے۔ تو پھر جو آپ کہیں گی۔ مان لوں
گا۔ اب سعیدہ اس دوسری کو دیکھنے جائیں گی۔“

حفصہ بیگم پریشان ہو کر لیٹ گئیں۔ شام کو
اسپتال کا بل بھی جمع کرانا ہے۔ کس سے کہیں۔

”آیا ہو سکتا ہے سعیدہ کو پسند نہ آئے۔ یا اگر وہ
خاندان کے دباؤ کی وجہ سے بظاہر کہہ دیں کہ نہیں پسند
آئی۔ تب۔ آپ تیار رہیں۔ اچھا ایک بات اور کہوں
گی۔“ وہ قدرے ہچکچا کر ان کو دیکھنے لگیں۔

”آپ! بیٹا آپ کا ہے۔ جیسا بھی ہے۔ آپ کے

زیر سایہ تربیت ملی ہوتی۔ تو آپ کی مرضی کے مطابق
ہو تا۔ امریکہ میں وہاں کے رنگ میں رنگ گیا تو کوئی
اچھے کی بات نہیں۔ اب آگیا ہے تو غنیمت جانیں۔
آپ! ماں کو بہت تقویت ہوتی ہے بیٹے کی ذات سے۔

اسے سمجھا بچھا کر۔ پیار محبت سے اپنا بنا میں۔ یہاں
کے طور طریقوں سے آگئی ہوگی تو اسے عقل آجائے
گی۔ سچ کہتی ہوں آپا۔ آپ کے نصیب جاگ جائیں
گے۔ اللہ میاں محفوظ دیا ہے اسے سمجھنے کا۔ آپ کو

اسے سمیٹنے کا۔ مار پیٹ، سختی ہمیشہ کارگر نہیں ہوتی۔

جہاں آپ کی سرزنش اس کو سدھرنے میں مدد دے گی۔

وہاں ماں کا پیار اور ماما اس کو سیدھے راستے پر چلنے کا
درس دے گی۔ ماما میں بڑی کشش ہے آپا۔ اور اولاد

بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ کا شکر کریں۔ کوئی ہے آپ

کا۔ اکیلی نہیں ہیں آپ۔ کوئی تڑپ ہے جو اسے واپس

لائی ہے۔ قدر کریں اس کی۔“

حفصہ بیگم سر نیچے کیے خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔
 ”آپا دیکھیں۔ بیٹی کے لیے آپ کو کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔ اس کے ماں باپ نے تو اسے نکاح کر کے مضبوط رشتے میں باندھ دیا کہ وہ محفوظ ہو گئی۔ لیکن آج وہ کتنی غیر محفوظ ہے۔ بے آسرا ہے۔ بیٹے کے ساتھ ایسی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ کم از کم بے بسی نہیں ہوتی۔“

رفیعہ انہیں تسلی دے کر کام میں لگ گئیں۔ کچھ دیر بعد آکر دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی طرح سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔

”اچھا۔ اب فکر کرنا چھوڑیں۔“ انہوں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”یقین کریں۔ وہ اگر بگڑا ہے۔ تو سدھر بھی جائے گا۔ آپ کی ایک بار کی سرزنش نے اسے احساس دلادیا ہو گا کہ ماں محبت کرتی ہے تو سزا بھی دے سکتی ہے۔ خیر۔“

”تمہارے سامنے ہے کوئی مثال۔ کہ بگڑی ہوئی اولاد سدھر گئی ہو۔“ وہ ایک دم بولیں۔

رفیعہ مسکرائیں۔ ”بے شمار، لیکن کم از کم آپ میں اتنی صلاحیت ہے۔ کہ اپنی اولاد کو سیدھا کر دیں۔ اچھا خیر چھوڑیں۔ ایک اور معاملہ ہے۔ آپ برا نہ مانیں۔ یہ۔ یہ لے لیں۔“ ایک لفافہ ان کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”یہ۔ آیا۔ کئی سال پہلے۔ جب اعزاز کے یونیورسٹی داخلے کے لیے میں نے آپ سے قرض لیا تھا۔“ ہچکچا رہی تھیں۔ ”آپ نے دے کر کہا تھا یہ قرض نہیں۔ اعزاز میرا بھی بیٹا ہے۔ تو۔ پھر۔ بعد میں اعزاز کی جاب بھی ہو گئی۔ میری ہمت نہ بڑی آپ کو یہ واپس کرنے کی۔ اب۔ اعزاز بھی ماشاء اللہ کما رہا ہے۔ تو اس نے دیے ہیں کہ وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنوں کی کچھ خدمت کر سکے۔ آپا! پلیز رکھ لیں۔ بچوں کو یہ احساس ہو جائے کہ جو ان کے برے وقت میں کام آتے ہیں۔ وہی خیر خواہ ہوتے ہیں۔ باقی تماشہ ہیں۔“
 ”جیسے تو یاد نہیں۔“ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

”مجھے پتا ہے آپ کس طرح سلوک کر کے بھول جاتی ہیں۔ مگر جن پر برا وقت آئے اور اس وقت جو ساتھ دے۔ اسے بھولنا نہیں چاہیے۔ مجھے یاد ہے۔ اس لیے کہ ان دنوں میں بہت پریشان تھی۔ کتنے لوگوں سے قرض مانگ کر شرمندہ ہوئی۔ کوئی کام نہ آیا۔ صرف آپ تھیں۔ جو دے کر بھی واپس نہ لینے کا وعدہ لے رہی تھیں۔“

ایک وقت وہ تھا۔ جب رفیعہ مانگ کر شرمسار تھیں۔ اور ضرورت پوری ہونے پر بھی شرمندہ۔ آج وہ دے کر شرمندہ ہو رہی تھیں اور حفصہ بیگم لیتے ہوئے۔ وقت کتنا بے رحم اور مہربان ہے۔ دونوں کے احساسات میں عجیب سی یگانگت تھی۔

”اچھا رفیعہ! میں چلتی ہوں۔ اسپتال کا چکر لگالوں۔ اگر آج ڈسچارج کر دیا تو گھر لے جاؤں گی۔ ممکن ہوا تو واپسی میں شاید دیر ہو جائے۔“ کھڑی ہو گئیں۔

”آپا، پھر گھر پر ہی رک جائیں۔ کہاں اکیلی آئیں گی۔ یا پھر ضرار کو لے کر یہیں آجائیں۔ سب سے مل کر اس پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”اس پر اچھا اثر پڑے۔ نہ پڑے۔ اصباح مر جائے گی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا۔“ کہہ کر باہر آ گئیں۔ اسپتال کے سارے معاملات۔ بلوں کی ادائیگی۔ پھر ڈاکٹروں کی ہدایتیں۔ سب درست۔ پرانی ٹھکسی ہوئی کھٹارا ٹیکسی۔ ویسا ہی بوڑھا گھسا ہوا اس کا ڈرائیور۔ اسپتال کے گیٹ پر وہی دستیاب تھا۔ ٹیکسی کی خوفناک آواز۔ رک رک کر چلنا۔ ضرار کو کوفت ہو رہی تھی۔ ”میں بہت جلد گاڑی لے لوں گا۔“ اماں کو دیکھ کر کہا۔

اماں نے ہونٹ سکوڑ کر منہ سڑک کی طرف کر لیا۔ گویا۔ اونہ۔ مجھے کیا۔ ضرار نے کم از کم یہی نتیجہ اخذ کیا۔ (اور سچ بھی یہی تھا۔) ٹیکسی سے اتر کر ڈرائیور کو دو ہزار دیے۔ ہمدردی۔

”اچھا۔ اب غور سے سنو میری بات۔“ گھر کے اندر پہنچ کر، ضرار کو کمرے میں لٹا کر انہوں نے اسے

متوجہ کیا۔ ضرار کے چہرے پر کمزوری کے آثار تھے۔ پورا سر پٹیوں میں اس طرح چھپ گیا تھا۔ گویا ٹوپی منڈھی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو گیا تھا۔

”وہ جو لڑکا۔ تمہارے ساتھ آیا تھا۔ اس کا فون نمبر بتاؤ۔ میں پڑوس میں جا کر کروں گی۔ اسے بلاؤں گی۔ اور تب تک تم اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹو۔ وہ آجائے تو جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔ میں نے جو کرنا تھا۔ کر لیا۔ اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تو یہ گھر تمہارے باپ کا ہے جہاں حق جتا کر رہو۔ یہ گھر میرے باپ کا ہے اور اس کی مالک میں اور وہ لڑکی ہے۔ جسے تم نے شکار کرنا چاہا تھا۔“

ہکا ہکا۔ بلکہ اس سے زیادہ پریشان۔ کن حالت میں وہ ماں کی کھردری خشک بے درد اور دل چیرنے والے جملے سن اور رہا تھا۔ نقاہت نے از سر نو حملہ کیا۔ آنکھیں بند کر کے شاید ابلتے آنسو اندر ہی دبا دیے۔ بولا تو آواز بھی جکڑی ہوئی تھی۔

”اماں! بہت برا ہوں۔ بہت سخت سزا کا مستحق ہوں۔ کس طرح معافی مانگوں۔ کہو تو ابھی سڑک پر جا کر لیٹ جاؤں۔ کوئی گاڑی کچلتی ہوئی گزر جائے۔ میرا خاتمہ اسی طرح۔ شاید آپ سے معافی مل جائے۔“

”اے سنو! میں باتوں سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ مر کر بھی تمہیں معافی نہیں ملے گی۔ کوئی ایک جرم تو نہیں ہے۔ لمبی فہرست ہے بیٹا۔ جس طرح تم نے تمہارے باپ نے مجھے تڑپایا ہے۔ مجھے اکیلا کر کے بے آسرا کیا۔ وہ تو الگ لگ رہا۔ تم نے تو بھری دنیا میں مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ سراٹھا کر جینے کے لائق نہ چھوڑا اور اب جو فخر سے سراٹھا کر آگئے ہو۔ بلا اجازت تو آتے ہی اپنا رنگ دکھا دیا۔ اب اس تمہارے کیے ہوئے کارنامے کے بعد میں خود بھی جان دے دوں تو اس معصوم پاک دامن لڑکی کے سامنے میری روض شرمندہ رہے گی۔ صرف ایک اس گناہ کی وجہ سے کہ تم کو دنیا میرے بیٹے کے نام سے جانتی ہے۔“

ضرار کی ہچکی بندھ گئی۔ نادم اور شرمسار۔

”وہ۔ وہ کدھر ہے۔ میں اس کے قدموں میں گر کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔“

”وہ تمہاری صورت دیکھتے ہی مرجائے گی۔ ایسی ہی ہے وہ میں نے پالا ہے سختیوں میں پابندیوں میں کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کردار پر اور اس نے میرے ہر اشارے کو حکم سمجھ کر تعمیل کی۔ وہ میرے پاس امانت ہے، منکوحہ ہے۔ سمجھتے ہو، تم نے جو کیا۔ چاہتی تو پولیس کے حوالے کر دیتی مگر جرم میرے گھر پر میری موجودگی میں ہوا تو سزا بھی مجھے ہی دینی تھی اب اٹھو، سامان سمیٹو اور چل پڑو۔“

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس کا رد عمل دیکھے بغیر دروازے کی طرف چلی گئیں۔ سنگ دل ماں کے زہریلے جملے، ایک ایک لفظ نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔ لمبے لمبے سانس لینے لگا، ایک لخت آکسیجن کی کمی محسوس ہوئی، کوئی عورت جس کا خمیر محبت، ایثار اور درد مندی سے گوندھا گیا ہو، ماں جسے مامتا کی تفسیر کہا گیا ہو، اتنی بے رحم، بے نیاز کیسے ہو سکتی ہے لیکن جب اپنے کردار پر توجہ کی اس ماں کو تنہا چھوڑ کر باپ کے لاپچہ دینے پر شوق کی خاطر چپکے سے چلے جانا اور سالوں خبر نہ لینا، باپ کا سلسلی وٹا، تمہاری ماں کا پورا خاندان ہے وہاں، اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ شاید اماں اپنے رویے میں حق بجانب ہوں، نہ جانے ان پر کیا گزری ہوگی، کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوں گے۔

دروازے پر شینہ اور کرائے دار لڑکا موجود تھے، شینہ نے کہا۔ ”آپ کب آئیں باجی۔“

اور لڑکا کہہ رہا تھا۔ ”میں نے آپ کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تھا۔ میں بھائی کا حال چال پوچھنے آیا تھا آجاؤں۔“

چاہتی تھیں اسے بھگادیں مگر شینہ کے چہرے پر دبا دبا سا جوش اور کچھ بتانے والی کیفیت۔ انہوں نے لڑکے کو اندر آنے دیا۔ شینہ کو لے کر اندر آئیں۔

”باجی۔ بڑی اہم خبر لائی ہوں۔“ من کرا نہیں سکتی میں لے آئیں۔ ضرار کے کمرے سے دور۔ ان کا کندھا ہا کر شینہ نے چپکے چپکے بتایا۔

”بابی آج کوئی عصر کا وقت ہوگا۔ میں آئمہ کی پھوپھی وغیرہ کو خدا حافظ کہنے گیٹ تک آئی تو آپ کے دروازے کے سامنے کچھ لوگوں کو کھڑا دیکھا۔“

پر جوش آواز میں بتانے لگیں۔

”میں نے پہچان لیا۔ ایک تو آپ کی سعیدہ بھابھی تھیں۔ دو ان کی بیٹیاں اور ایک جوان خوب صورت سا لڑکا۔ میں اوٹ میں ہو گئی۔ کان ادھر لگا دیے کہ سنوں تو سہی۔ سعیدہ بہت حیرانی سے کہہ رہی تھیں۔ ارے یہ کہاں لے آئے ہو۔“

پھر دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران لڑکے کو دیکھ رہی تھیں۔ لڑکا بولا ”بس یہی گھر ہے۔ اسی گھر میں رہتی ہے وہ مگر یہاں تو لاک لگا ہوا ہے۔“

سعیدہ کہنے لگیں ”دیکھو میں بہت پریشان ہوں۔ نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہو تم۔ پتا نہیں مذاق ہے یہ یا کیا۔ تمہارے ابا ہیں وہ مجھے طعنے دیتے رہتے ہیں تم کو کوئی دھوکا ہوا ہوگا۔ آخر تم نے کیا دیکھا یہاں۔ راستہ بھول گئے ہو۔ چکر کیا ہے۔ وہ لڑکا کہنے لگا۔ ”واہ راستہ کیوں بھولوں گا۔ دو مہینے گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر نگرانی کی ہے۔ یہیں جاتی ہے وہ لڑکی۔“

ثمینہ کا حلق خشک ہو گیا، نلکے سے ہی ایک چلو پانی پی کر پھر شروع ہو گئیں۔

”سوری بابی۔ لڑکیاں جو چپ کھڑی تھیں۔ دونوں بولنے لگیں۔ تم نے اس سے بات کیوں نہیں کی۔ تم کچھ پوچھتے وہ کچھ بتاتی پتا تو چلتا۔“

لڑکا بولا۔ ”یہ بات کرتا اتنا سخت بردہ منہ ڈھانکے رہتی ہے اور بس سے اتر کر گلی میں آئی تو دوکان پر بیٹھے بڑے میاں ان کے پیچھے چل پڑتے۔ دو لڑکیاں ہیں۔“

دوسری برابر والے گھر میں جاتی ہے۔ برابر آتا رہا ہوں میں۔ پاگل نہیں ہوں کہ راستہ بھول جاؤں گا۔ تو سعیدہ نے کہا۔ گھر چلو، سیدھا راستہ تو میں تمہیں دکھاؤں گی۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں ”لڑکا غصہ کرنے لگا۔“

کسی پڑوسی سے پوچھیں تو سہی۔ یہ کہاں گئی ہیں۔ بس بابی یہ سن کر میں نے گلی میں منہ نکالا اور سعیدہ کو سلام کیا۔ میں نے کہا ”آپ۔ کہنے لگیں ہاں۔ بغیر اطلاع

کے آئے ہیں۔ معلوم نہ تھا گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آپ بتا سکتی ہیں میں نے کہا جی۔ وہ کسی رشتے دار سے ملنے گئی ہیں۔ شاید کل آجائیں۔ وہ کچھ مایوس ہو گئیں۔ پھر آپس میں کچھ چکے چکے بات کر کے چلی گئیں۔ میں نے تو انہیں اندر آنے کا بھی کہا لیکن بابی ایک اور بات بتاؤں۔“

وہ مزید پر جوش پر اسرار انداز میں قریب آکر کہنے لگیں۔

”میں نے آئمہ سے ذکر کیا۔ وہ کہنے لگی ”امی کچھ دنوں سے ایک لڑکا کالج سے بس اسٹاپ تک پیچھا کرتا تھا۔ موٹر سائیکل پر ہوتا تھا۔ دادا کی وجہ سے شاید وہیں گلی کے سرے پر کھڑا ہو کر دیکھتا رہتا تھا۔ بابی ہے نا بمبائٹک خبر۔“ بابی بے تاثر۔

”بابی۔! بیٹا کیسا ہے اب آپ کا۔ ٹھیک تو ہے۔“ اتنی بڑی خبر کے بعد بابی کا رویہ۔

”اے۔ کیسا ہوتا۔ ڈھیٹ ہڈی۔ پڑا ہے بستر پر۔ چلو تم بھی دیکھ لو، میں نے تو اسے گھر سے جانے کا کہہ دیا ہے۔“

بابی جو ثمینہ کی داستان سن کر گرم صم ہو گئی تھیں۔ پھر اپنی جون میں آگئیں۔ ثمینہ نے کمرے کے باہر سے ہی ضرار کی خیریت دریافت کی، تو وہ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ سر ہلا کر بولا۔ ”جی۔ ٹھیک۔“

”اے بابی۔ بچہ بہت کمزور ہو گیا ہے، میں ابھی جا کر سیب کا جوس نکال کر بابی کے ہاتھ دیتی ہوں، اسے طاقت کی ضرورت ہے، دوا میں تو خون سکھا دیتی ہیں۔“

”رہنے دو۔ اسے طاقت کی نہیں۔ ہدایت کی ضرورت ہے۔“ کہہ کر ثمینہ کو اشارے سے بلا کر لائیں۔ برآمدے میں نماز کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔ ثمینہ بھی بیٹھ گئیں۔

”بابی۔ پھر اب۔ آپ کیا کریں گی۔ سعیدہ نے اگر۔“ شکر ہے۔ بابی اب متوجہ تو ہو میں۔

”وہ اگر مجھ سے کچھ کہیں گی۔ تو جواب دوں گی۔ خلع یا طلاق۔ بات ختم۔“

ثمینہ دنگ۔ کرائے دار لڑکا آکر بولنے لگا۔ ”آئی۔ بھائی بہت کمزور ہیں۔ آپ کی اجازت ہو۔ تو رات کو میں آکر ان کے پاس رک جاؤں۔ شاید کچھ ضرورت۔“

”نہیں بھیا۔ شکریہ تمہارا۔ یہ تو ابھی یہاں سے چلا جائے گا۔ میں بھی گھر بند کر کے اپنی بہن کے گھر چلی جاؤں گی۔“ ثمینہ نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اچنبھا۔ حیرت، لڑکا بھی حیران۔

”باجی! ایسا ظلم تو نہ کریں۔ بچہ ہے۔ غلطیاں بچے کرتے ہیں۔ اب سزا تو مل گئی۔ رات میں کہاں جائے گا۔ معاف کر دیں۔“

”سزا ملنے کے بعد گناہ معاف ہو جاتا ہے کیا۔ ہاں اگر انسان ہو تو۔ درندوں کو تو مار دینا چاہیے۔“

ضرار لڑکھڑاتا ہوا آیا۔ زمین پر گر کر ان کی گود میں سر رکھ کر بلکنے لگا۔ ایک ماں۔ بظاہر اصولوں کی سخت مذہبی اقرار کی پابند۔ لیکن ایک دل ہے۔ ماں کا دل۔ جو اولاد کے لیے کبھی کبھار بے اصولی برداشت کر لیتا ہے۔ کرائے دار لڑکا چپ چاپ چلا گیا۔ ثمینہ منمنار ہی تھیں۔

”باجی! اتنی سختی تو اللہ کو بھی پسند نہیں۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی گری ہوئی حرکت نہیں کی۔ میں تو کہہ رہا تھا۔ چلو واک کرتے ہیں۔ پتا نہیں وہ کیوں ڈر گئی۔ میں نوکرائی سمجھ کر۔“

”یہاں رانی اور نوکرائی سب کی عزت برابر ہے۔ سمجھا اور میں نے جب کہا اس کا ہاتھ چھوڑ۔ تو نے میری بات سنی۔؟“

”ضد آگئی تھی۔ اس نے بھی مجھے زور سے لات ماری۔ نہیں تو۔ اماں قسم سے۔“ خبردار۔ میرے سامنے جھوٹی قسم نہ کھانا آئندہ۔ معاف نہیں کروں گی۔ چل اٹھ اور جا کر لیٹ۔ کبخت ذلیل اولاد۔“

ثمینہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے لگیں۔ وہ پھر رو رہا تھا۔ ”اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ اماں! بہت

دن آپ سے جدا رہا۔ اب نہیں۔ پلیز۔“

”اچھا اچھا۔ دھوکے باز باپ کی اولاد۔ بھول چکی تھی کہ کوئی بیٹا بھی ہے۔ نہ جانے کہاں سے آگیا۔“

”ثمینہ نے ضرار کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ کمرے میں لے جا کر چند نصیحتیں اس کی سماعت کی نذر کیں۔

ماں کا رتبہ۔ ماں کی مامتا۔ باہر آکر کہا۔

”باجی رات کے لیے کھانا بھیج دوں گی۔ تھک گئی ہیں۔ کہاں پکا میں گی۔“

”نہیں۔ پکالوں گی۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہارے گھر

آکر اصلاح کو فون کروں گی۔ اس سے تو کہا تھا کہ میں آجاؤں گی۔“

ثمینہ کے جانے کے بعد کچن کی راہ لی۔ دودھ والا کئی

دن سے آیا نہ تھا۔ خشک دودھ ہمیشہ رکھتی تھیں۔

چائے بنا کر بسکٹ لے کر کمرے میں آئیں۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہ۔ میرے لیے۔“

”ہاں۔ تھوڑے بسکٹ اور نمک پارے ہیں۔

رات کے لیے مرغی پکالیتی ہوں۔ رکھی ہے۔ اس دن کی بریانی بھی اگلے دن آکر فریز کر لی تھی۔ خیر۔ وہ کل

سی۔ کل سبزی۔“

جانے کونسا بوجھ تھا۔ بول بول کر ہلکا کر رہی تھیں۔

(بیٹا ماں کی طاقت ہوتا ہے۔ اور اگر بد طبیعت ہو۔ مجھ کو

اکیلا سمجھ کر گردن دبا دے۔ کیا بھروسہ باپ نے پٹی

بڑھا کر بھیجا ہو۔ لالچ سوار ہو جائے۔ تو۔ باپ بیٹا۔

ایک ذات۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو

تھوڑا تھوڑا۔ اتنے سالوں بعد محبت جاگ پڑی اور کیا

معلوم۔ گھر پر قبضہ کرنے کا ارادہ ہو۔ دل کی بات کون

جانے) کچن میں مصروف تھیں۔ ہاتھوں سے زیادہ

ذہن کام کر رہا تھا۔ سوچ کا گھوڑا سرپٹ انجانی راہوں کی

سمت اڑا جا رہا تھا۔ ہائے یہ وہم۔ اور سو سے۔

اصباح کو فون کرنا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچتی ہوگی۔

اور اب نیا معاملہ۔ لڑکا خود اپنی انجانی منکوحہ کو پسند کر رہا

ہے۔ اس کو۔ جس سے انکار کر رہا ہے۔ او بھئی! آج کی

نسل ہے۔ سیدھی طرح ناک پکڑنے کے بجائے پیچھے

سے گدی کی طرف سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑے گی۔ اور خوش کہ میدان مار لیا۔ عقل بھی تو گدی کے پیچھے ہوتی ہے۔ اچھا بچو۔ اب تم ذرا دیکھنا۔

”اماں! میری وجہ سے کتنی تکلیف ہو رہی ہے آپ کو۔“ سناٹے سوچ کے میدان میں آواز۔ اچھل پڑیں۔

”ہٹے ہٹے ڈرا دیا مجھے کیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ مارے گا مجھے بدلہ لے گا؟“

اس کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر دوسو سوں نے حقیقت کی راہ لی۔ ضرار نے اچھے سے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا اور پھینکا۔ جیسے وہ سانپ ہو۔

”برآمدے میں رکھا تھا۔ سارے کے لیے پکڑ لیا۔ اتنا ذلیل نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا۔ آپ کا خون پلٹ گیا۔ انہوں نے اسے پیچھے دھکیلا۔

”جس باپ کا خون تیرے اندر دوڑ رہا ہے۔ اس سے ہر برائی کی توقع کر سکتی ہوں میں۔ ظالم۔ جابر۔ خود غرض۔ کینہ پرور۔ خون کے آنسو رلائے تھے۔“

”آپ کا خون زیادہ طاقت ور ہے۔ دودھ کی تاثیر بھی ہے۔ یقین کریں۔ بہت پچھتا مارا۔ وہاں ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ ان کے درس پر جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ بہت سمجھایا۔ آپ کا بیٹا بن کر دکھاؤں گا۔ کہو تو حلف اٹھاؤں۔“

”حلف کا مطلب جانتا ہے۔“ طنزاً کہا۔

”جی۔ مسلمان ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں۔“

اماں کا دل۔ یک دم مضبوط ہو گیا۔ ”کمرے میں جاؤ۔ دوا کھائی کہ نہیں۔ مجھے ٹینہ کے گھر فون کرنے جانا ہے۔ اگر روٹی پکاؤں گی۔“

”گھر پر فون۔ لگوا یا کیوں نہیں؟“ ٹال کر باہر آ گئیں۔ ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ ٹینہ کے دروازے پر اس کے سر کھڑے تھے۔ سلام۔ خیر و عافیت۔ بات کر کے اندر آ گئیں۔ ٹینہ بو کھلائی ہوئی آرہی تھیں۔

”آپ آ گئیں۔ میں آپ کو بلا نے والی تھی۔ وہ رفیعہ بہن کا فون آیا تھا۔“ ناجیہ کو آج ماں کے انداز

میں کچھ نیا پن لگ رہا تھا۔ امی، آئندہ کو تو بتا بھی دیتی تھیں۔ ناجیہ کو نا سمجھ کہہ کر ہر بات چھپاتی تھیں۔ وہ کھونج میں تھی۔ آخر اصباح کا معاملہ ہے کیا۔ آئندہ کو اگر خبر بھی بھی تو اس نے نہیں بتایا۔ آنٹی کو آنا دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہوئی۔ مگر امی۔ کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ بند۔ وہ گیلری والے دروازے کی طرف چلی۔ وہاں ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا کھڑکی کا۔ ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ امی کی بات ختم ہو گئی تھی۔ خالہ بی سوچتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اچھا۔ یہ بات ہے۔ میں رفیعہ سے بات کر لوں ذرا۔“ ٹینہ نے نمبر ملایا۔ اور خود کمرے سے باہر چلی گئیں۔ خالہ بی رفیعہ سے بات کرنے میں سر ہلاتی جا رہی تھیں۔ پھر کہا۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم کل ہی انہیں بلاؤ۔ ماں بیٹے دونوں کو۔ اور اب ذرا اصباح کو فون دو۔“

”ہاں بچی۔ نہیں آسکی۔ ضرار گھر آ گیا ہے۔ بہت معافیاں۔ خیر۔ یہ بتاؤ۔ جب میں نے نماز کی نیت باندھی۔“ آواز دھیمی ہو گئی۔ اب شاید اصباح کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ گردن ہلاتی رہی تھیں۔

”اچھا خیر۔“ بہت شرمندہ ہے۔ معافی مانگنے کا کہہ رہا ہے۔ اب سنو غور سے۔ جو میں بتاتی جاؤں۔ وہی کرنا ہے تمہیں۔ وہی کہنا ہے۔ کل جب سعیدہ آئیں۔ ہاں ہاں۔ کل آئے گی۔ تو تم۔

”افوہ! شاید زاہد کو بھی ابھی آنا تھا۔ مسجد سے آتے ہیں تو لڑتے جھگڑتے۔ جیسے وہاں یہی سبق ملتا ہو۔ تالاق۔ ایک لفظ سننے نہیں دیا۔“ مایوس ہو کر باہر آ گئی۔ ٹینہ دونوں کی صلح کر رہی تھیں۔ روز کا معمول تھا۔ خالہ بھی آ گئیں۔

”لو بھئی ٹینہ! رفیعہ سے بات ہو گئی ہے۔ اب تم دیکھنا کیسا رگڑتی ہوں سعیدہ کو اور اس کے بیٹے کو۔ کل رفیعہ فون کرے تو مجھے بلا لیتا۔ میں نے سمجھا رہا ہے رفیعہ کو۔ اصباح کو بھی۔“

ٹینہ مسکرائیں۔ ”اب آپ فون لے لیں۔“ وہ جانے لگیں تو ٹینہ نے ایک ڈش ان کو دی۔

”میں خود لے کر آنے والی تھی۔ ویسی مرغی کا سوپ ہے۔ سبزی اور سیب بھی ڈالا ہے۔ بہت طاقت کی ضرورت ہے بچے کو۔ کل سیب لے کر آؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔“

دونوں خواتین ہشاش بشاش مسکرا رہی تھیں۔
ضرار برآمدے میں نماز پڑھ چکا تھا۔ (یا ایکٹنگ کیا پتا)

”تم نے سجدہ کیسے کیا۔ سر نیچے کرنے میں زخم میں درد نہیں ہوا؟“

”ہوا۔ مگر آپ کے ڈنڈے کی چوٹ سے بہت کم۔“ بے فکر تھا۔ ”۲ صبح میں کمرے میں گھبراہٹ ہوئی تو باہر آگیا۔ نماز کی چوکی دیکھی۔ تو یاد آیا کئی دن سے اللہ کو بھولا ہوا ہوں۔ نماز پڑھی۔ اب سوچ رہا ہوں۔ آپ اکیلی اتنے سال کیسے رہیں۔ اب اپنی خطا زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ کاش۔ میں نے حماقت نہ کی ہوتی۔“

”اچھا اچھا۔ اب جا کر لیٹو۔ درد نہ برھ جائے۔ ڈاکٹر نے آرام کا کہا تھا۔ کل جا کر پٹی بھی کروالینا۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

”اور یہ کیا ہے؟“ ان کے ہاتھ ڈش دیکھ کر پوچھا۔
پھر ڈھکن کھول کر دیکھا۔
”واہ۔ شکل تو بہت اچھی ہے اور خوشبو بھی مزے کی۔“ کچھ دیر بعد دونوں ماں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔
دونوں کا موڈ اچھا تھا۔

”یہ دیوار کب بنی؟“ وہ جب امریکا گیا تھا دیوار نہ تھی۔ بڑا کشادہ صحن تھا۔

”جب تم بھی دھوکا دے کر بھاگ گئے تو کرائے دار رکھ لیے۔ اس لیے کہ میرے آڑے وقت میں کوئی قریب ہو جس کی مدد لے سکوں مگر اتفاق دیکھو جس دن تم آئے اس سے پہلے ان کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تمہارے مبارک قدموں کی بدولت ان لوگوں سے مدد لی۔ جن کو دن رات برا بھلا کہتی تھی۔“

”مگر مجھے تو اچھے شریف لوگ لگے۔ یہ جو لوگ۔“ لیٹ رہا تھا تو اماں حلق میں دوا ڈال رہی

تھیں۔

”ہاں۔ تم کو تو لگیں گے ہی۔ جیسے تم دغا باز۔ ویسے ہی یہ۔ ہر شخص آئینے میں اپنا چہرہ ہی تو دیکھتا ہے۔“
کھانے کے برتن اٹھا کر لے گئیں۔ باہر سے پکارا۔
”سو جاؤ اب۔“

اور وہ فرماں برداری کے ریکارڈ برابر کرنے کے چکر میں فوراً ”آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دوا میں شاید نیند کا عنصر بھی تھا۔ گہری نیند آئی۔ صبح آنکھ کھلی۔ چڑیوں کی چکار سے۔ کھڑکی سے جھانکا۔ آہا۔ بڑی سہالی صبح۔ نرالا سا موسم۔ ہوا میں خشکی۔ چار دن سے کمرے میں رہتے ہوئے اندازہ ہی نہ ہوا۔ کیسی رنگیلی صبح ہوتی ہے۔ آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑے کچھ سفید۔ کچھ کالے۔ کچھ نارنجی۔ سورج کی کرنوں میں نہائے ادھر سے ادھر منہ گشت کر رہے تھے۔ باہر نکل کر لطف لیا۔ چنبیلی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ انار کے درخت میں سرخ کلیاں خوش رنگ۔ کچن کھول کر جائزہ لیا۔ ساس پین میں پانی چولہے پر رکھا۔ چولہا جلانے کا کوئی اندازہ نہ ہوا۔ پھر امریکا کے بیکلی کے چولہوں کو بھلا کر مچس پر نظر جمائی کھٹ پٹ کی آواز سے اماں ہوشیار ہوئیں۔ سیدھی پچن میں۔
”ہائیں۔ یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”چائے بنا رہا ہوں۔ آئیے۔ آپ کے لیے بھی دم کر دی ہے۔“ چائے چھوٹی چائے دلی میں دم کر چکا تھا۔ دو مک، چینی دان، خشک دودھ کا پالہ، ڈھونڈ، کر میز پر رکھ دیا تھا۔ بسکٹ بھی پلیٹ میں رکھے تھے۔

”واہ۔ بڑا سلیقہ آگیا ہے۔ وہاں کیا کسی وزیر سفیر کے گھر خانہ ماں لگ گئے تھے۔“ زور سے ہنسا۔ بے ساختہ اونچا مروانہ قہقہہ۔ کچن گونج گیا۔ صحن تک بازگشت سنائی دی۔ انوکھا۔ برسوں سے یہ گھر کسی مروانہ ہنسی سے محروم تھا۔ جو کبھی کبھار رشتے دار مروانے آتے بھی تھے۔ خالہ بی کی تنگ مزاجی کی وجہ سے تیز سے بیٹھتے تھے۔ قہقہہ درکنار۔ ہنسنے کی آواز بھی نہیں سنی گئی۔ خالہ بی کو آج یہ آواز۔ کھنک دار قہقہہ بہت دل خوش کن لگا۔ تقویت۔

”چائے تو اچھی بنائی ہے۔ بھئی اور کیا کیا بنانا جانتے ہو۔ کھانے میں۔“ (انٹروپو)

”ارے۔ میں وہاں کوئی۔ افوہ۔ وہاں تو ہر چیز ڈبوں میں بند مل جاتی ہے۔ بس فرائنگ پین میں ڈالو اور تیار۔ آپ چاہیں گی تو کچھ سیکھ لوں گا۔“ ہائے فرماں برداری۔ پتا نہیں باپ نے کیا کیا سکھا کر بھیجا ہو گا۔ شکوک ختم ہی نہیں ہوتے۔

”ناشتا بنانا سیکھ لو۔ آلیٹ، حلوہ پوری، آلو اور پننے کی ترکاری۔“

”آہ۔ آہ اور پھر۔ آہ۔ نہیں ںں۔ ظلم کے پہاڑ نہ توڑیں۔“ تڑپ گیا۔

”آپ کیا روز اتنی دیر سے اٹھتی ہیں۔“
”اٹھتی تو جلدی ہوں۔ اصباح کے لیے ناشتا بنانا۔ کالج جاتی تھی۔ آج تو دیر تک جاگتی رہی کہ پتا نہیں۔ تم رات میں کون سی چیز لے کر بھاگ جاؤ۔“
”میں؟“ حیرت۔ ”اور اپنا سامان چھوڑ کر آپ کی کوئی چیز چرواؤں گا۔“ پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ”یہاں کون سی ایسی قیمتی چیز ہے جسے لے کر بھاگوں گا۔ افوہ۔ بہت ہی مذاقہ ہیں آپ۔ ابھی کھولتا ہوں سوٹ کیس۔ کیا کیا چیزیں آپ کے لیے لایا ہوں۔ دنگ رہ جائیں گی آپ۔“ کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں حرام کی کمائی کی نہ ہو۔“ بے مروتی سے منہ بنا کر یکسر مسترد۔ بے چارہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

”لگتا ہے۔ مجھے ایک قرآن شریف چھوٹا سا، ہر وقت جیب میں لے کر پھرنا ہو گا۔ آپ کے سامنے حلفیہ بیان دینے کے لیے۔“ چند سیکنڈ بعد حواس درست ہوئے تو بولا۔

”اور یہ آپ کر کیا رہی ہیں؟“ انہیں برتن ادھر سے ادھر کرتے دیکھا تو کہا۔

”یہ۔ تمہارے استعمال کے برتن۔ الگ کر رہی ہوں۔ یہ پلیٹ، مگ، چمچ، پیالہ یہ تمہارے ہیں، میرے برتن استعمال نہ کرنا۔ کیا پتا۔ وہاں تم سو رکھاتے رہے ہو۔ شراب پیتے ہو گے، نپاک پلید منہ ہاتھ۔“ بے

دردی۔

ضرار سر تھام کر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا ”اووف۔ میرے پروردگار۔ رحم کر۔ اس ایک اکلوتی ماں کے ساتھ رہ کر کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔“

”دیکھو۔ اگر پچھتا رہے ہو۔ تو مت رہو یہاں۔ جہاں سے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ وہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ جو چار دن زندگی کے رہ گئے ہیں گزار لوں گی۔“

فورا ”کھڑے ہو کر ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔“
”لیکن۔ مجھے تو آپ کی ضرورت ہے، میری ماں۔ میری جنت آپ کے قدموں میں ہے۔ جنت چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں پچھتاؤں گا۔ وعدہ۔“ چٹا پٹ بو سے لے رہا تھا۔

انہوں نے بزور اسے خود سے الگ کیا۔ ”ہٹ برے۔ جھوٹوں کا استاد۔ یہ انگریزوں والی چوہا چالی مجھے یقین نہیں دلا سکتی اور اول تو۔ ابھی یہ بھی یقین نہیں کہ امر کا گیا بھی تھا۔ ایسی اردو۔ وہاں سے آنے والا نہیں بولا کرتا۔ پتا نہیں کسی جیل میں ہی پڑا تھا۔ چھوٹ کر ماں یاد آئی۔“ اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔
”جیل سے چھوٹ کر؟ اتنا سامان لے کر؟“ ہونق شکل بن گئی۔

لفظی جنگ ہوتی رہی۔ کام ہوتا رہا۔ ناشتا زبردست۔ حلوہ پوری آلو کی ترکاری۔ نہ جانے دل میں کتنے ارمان پل رہے تھے۔ کیسے کیسے نکالیں ہا۔ یہ اولاد۔ نہ جانے کیوں دل کے چپے چپے پر قبضہ جما کر بیٹھ جاتی ہے۔

گو کہ ناشتا کافی ہوئی تھا۔ ضرار نے دوپہر کے کھانے کا منع بھی کیا، مگر وہ کھانا تیار کر کے اسے بتا کر۔ دوا کی تاکید کر کے خود نہادھو تیار ہو کر بغیر بتائے چلی گئیں۔ کہاں جا رہی ہیں پوچھتا رہ گیا۔

وہ ٹینہ کا دروازہ بجا رہی تھیں۔ ادھر رفیعہ کے گھر میں۔ خالہ بی کا ایکٹ کیا ڈرامہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ سعیدہ بیٹے بیٹیوں سمیت صبح ہی پہنچ گئیں۔

اصباح خالہ بی کی ہدایت کے مطابق اپنا زعفرانی

سوٹ جس کے دوپٹے پر کاسنی پھول بنے ہوئے تھے۔ کاسنی ستاروں کی لیس لگی تھی۔ پن کر آنکھوں میں کاجل لگا کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے مکالمے یاد کر رہی تھی۔ (خالہ بی کے) سعیدہ لوگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ چائے نمونے ایک وغیرہ کی ٹرائی ان کے سامنے رکھ کر اجیہ اصباح کے پاس آئی تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ تہمتا رہا تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر چمکی۔

”لو جی۔ ادھر تو زبردست سین چل رہا ہے۔ امی کی خوشامد ہو رہی ہے کہ خالہ بی کو منامیں۔ وہ ناراض ہیں کیونکہ امی سے خالہ بی خوش ہیں تو اب ان ہی پر وار ہوا ہے اور جناب ہماری امی۔ وہ خالہ بی کی پوری پوری شاگردی کر رہی ہیں کہ میں نامانوں۔ تڑپ رہی ہیں مومانی اور سب سے بڑھ کر میٹا جو گھبراہٹ کا شکار ہے۔ ٹانگیں ہلائے جا رہا تھا۔ جیسے کپکپی چڑھی ہو۔ ہونٹ چبا رہا ہے۔ ارے وہی ہے جو میں نے ثریا آپا کی رخصتی کے بعد دیکھا تھا۔ چلو۔ تمہارا بلاوا آیا ہے۔ اتنی بے قرار ہیں کہ یہیں نہ آجائیں کہیں۔“

یہ ملاقات بھی انوکھی تھی۔ کبھی اس طرح اس سے نہیں ملی تھیں مہرانو، شہربانو۔ تینوں ماں بیٹیاں اٹھ کر اس سے لپٹ گئیں۔ کھینچ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ لڑکا اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ پلکیں جلدی جلدی ہٹھٹا رہا تھا۔ ہونٹ چباتے چباتے لال سرخ کر لیے تھے۔ ہتھیلی کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔ نظریں اصباح پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اصباح معصومیت سے نظر جھکائے لیس لگے دوپٹے سے سر ڈھکے بت بنی بیٹھی تھی۔ خالہ بی کی ہدایت کے مطابق۔ زعفرانی رنگ کے دوپٹے میں اس کا رنگ دمک رہا تھا۔ اوپر سے کاجل بھری آنکھیں لمبی گھنی پلکیں چین قرار لوٹنے کو تیار۔ (لڑکے کا) پھر مومانی نے رفیعہ خالہ سے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

”بس بھی۔ اب بلاوہ حفصہ باجی کو۔ ہم کو ہماری امانت واپس کریں۔ اب صبر نہیں ہوتا۔“

رفیعہ خالہ نے کہا۔ ”مگر ابھی کل ہی تو وہ آپ کے

گھر سے آئی تھیں مابوس ہو کر۔ وہ تو خلع کے لیے تیاری کر رہی ہیں، طے کیے بیٹھی ہیں۔“

اتنا سنتے ہی تینوں بلبلا کر کچھ بولنے لگیں۔ لڑکے پر اور طرح کا دورہ سا پڑ گیا۔ کھڑا تھا۔ دھم سے کرسی پر گرا تقریباً۔ زبان ہونٹوں پر پھیرنے لگا مابروٹو، انگلیاں زور زور سے چٹخانے لگا۔ سر پر بلاوجہ مکے برساتا شروع کر دیے۔ بہنیں اور اماں جان۔

”وہ تو یہ ہوا۔ اصل میں پتا نہ تھا۔ ارے برسوں کا بندھن۔ ایسے کیسے۔ اور ہم نے انکار کب کیا۔ ہم تو وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ میں فون کرتی ہوں حفصہ کو۔“

سعیدہ انھیں۔ رفیعہ نے اطمینان سے کہا۔ ”ان کے پاس فون نہیں ہے۔“

”اوہ۔ ہاں۔ تم نے انہیں بتا تو دیا تھا ہمارے آنے کا۔“

”نہیں۔ کیسے جاتی؟“

”پڑوس میں جو رہتی ہیں ان کے گھر تو فون ہے۔ ان سے کہو۔ فون پر بلو ادیں۔ میں ان سے خود بات کروں گی بلکہ یہاں آنے کا کہوں گی۔ رفیعہ پلیز۔“

رفیعہ طے شدہ منصوبے کے تحت انھیں۔ بظاہر مابول ناخواستہ۔ کچھ دیر بعد آکر بتایا۔

”میں نے ٹینے سے کہا ہے۔ بچے کو باجی کے گھر بھیج کر بلو ادیں۔ کہتی ہیں کہ پانچ منٹ انتظار کریں۔ وہ خود کال کر لیں گی آکر۔“

”ہاں۔“ سعیدہ نے سکھ کا سانس بھرا۔ ”کیونکہ اب میں دیر کرنا نہیں چاہتی۔“

اور اب وقت تھا اصباح کی برقرار منس کا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور مومانی کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔

”مومانی! بس۔ مجھے اور تماشا نہ بنائیں۔ میں کھلونا نہیں ہوں۔ نہ ہی مٹی کی گڑیا۔ کئی بار پہلے آپ خود انکار کر چکی ہیں۔ ساموں نے مہینوں سے میری شکل نہیں دیکھی۔ آپ لوگوں نے مجھ سے بے زاری کا کئی دفعہ اظہار کیا ہے۔ میں خود اب اس رشتے کو قائم نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھے اب اپنی توہین گوارا نہیں۔ پلیز۔“

میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی اس رشتے سے۔ خالہ بی سے بات کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے خود کسی سے واسطہ نہیں رکھنا۔ نہ آپ سے۔“

سعیدہ مومانی تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں کی مثال بن گئیں۔ رنگ فق تھا۔ بولیں تو آواز بھی کنویں کی گہرائی سے برآمد ہوئی۔

”بیٹا! میری بچی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو معیذ کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئے۔ تو پھر۔“

”جی! کہ وہ آئے اور اپنی پسند کی کوئی امیرزادی تلاش کرے تو پھر میرا تماشا بنانے کی کیا ضرورت۔ دو مہینے ہو چکے ہیں اس بات کو۔ آپ نے سانس نہ بھری۔ کر لیں آپ اپنے بیٹے کی مرضی اور پسند کی۔“

”ارے۔ وہ دو سری کون۔ وہ تم ہی تھیں جسے اس نے پسند کیا۔ بگلا۔ تمہاری شکل یاد نہ تھی۔ بچپن میں تو پھر۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ تم ہوگی۔“

”مگر مجھے خبر تھی مومانی۔ آپ کچھ بھی کہیں۔ دو سری لڑکی پسند کی۔ اب وہ میں ہوں یا کالی دیوی کلکتے والی۔ مجھے غرض نہیں۔ میں بار بار اپنی ہتک برداشت نہیں کر سکتی۔“ کہہ کر باہر کی طرف چلی۔ لڑکا کھڑا ہو گیا۔

”دیکھو۔ (ہونٹ چبائے) میں بتاتا ہوں۔ (مکا رسید کیا سر پر) ایسا ہوا کہ مجھے پتا نہ تھا کہ تمہارا گھر وہاں۔“

اصباح تیزی سے باہر نکلی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ مظاہرہ ناقابل فراموش۔ یہ کیا کر کے آگئی ہوں۔ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ کمرے میں گھس گئی اور یاد کرنے لگی۔ خالہ بی نے اور کیا کیا کہا تھا۔ یہ کہنا وہ کہنا۔ لڑکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے بلکہ انکار کرنے کا بھی کہنا تھا۔ وہ تو ہو نہیں سکا۔ اس قدر تو ہنسی آرہی تھی۔ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تو بھاگ آئی۔ بوکھلاہٹ سوار تھی بے چارہ۔ ہائے مگر اچھے سے تو ہیں۔ کیسے مجھے دیکھ رہے تھے۔ خواہ مخواہ بکواس کر کے۔ اوہو۔ خالہ بی

نے کہا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے۔ بس۔ اب اگر۔ وہ سچ سمجھے۔

”سنو اجیہ!“ اجیہ کو یکراں وہ آگئی۔

”سنو اجیہ! میں۔ کیسی لگ رہی ہوں۔ اچھی؟ بہت اچھی؟ یا۔“

”او میری بہنا۔ ایسی ویسی؟ اچھی ی ی ی۔ پیاری ی ی کہ وہ صاحب بے ہوش نہ ہوئے یہی حیرت ہے۔ اب مومانی پھر تمہارے پاس آرہی ہیں۔ تمہیں منانے اس سے پہلے کہ خالہ بی رشتہ ختم کرنے کا اعلان کریں تم خالہ بی کو متالو۔ رشتہ پکا کرنے کے لیے ہوشیار۔ وہ آرہی ہیں اور وہاں لڑکا ایک سو ایک جان سے تم پر عاشق ہو چکا ہے۔ نڈھال پڑا ہے۔ میں اس کے لیے گلو کو زلی سنگھین بنانے جارہی ہوں۔“

پھر جاتے جاتے۔ ”عمے کی شکل بنا کر بیٹھو“ مسکراؤ مت۔ کہہ کر ٹل گئی۔

مومانی آگئیں۔ اصباح کو منانے۔ لپٹانے۔ ”میری بچی۔ میں تو کئی دن سے تمہارے گھر کے چکر لگا رہی ہوں۔ (جھوٹ) گھر بند دیکھ کر آجاتی تھی۔ کل وہ شینہ ملی تو۔“ لڑکا۔ ماں کے پیچھے آگیا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ (شرم کیسی۔ منکوحہ ہے۔)

”اس دن جب خالہ بی آپ سے ملنے گئیں۔ تو آپ نے صاف کہا کہ آپ کا بیٹا بچپن کی اس واردات کو گڈے گڑیا کا کھیل کہہ کر انکاری ہے۔ جہاں وہ کہے گا ہم وہیں اس کی شادی کریں گے تب تو آپ نے گھر کے چکر لگانے کا ذکر نہیں کیا۔“

”وہ تو بس۔ ایسے ہی۔ ہے ہے ہے۔“ ہنسنے کی بھونڈی کوشش کھسیانی سی۔ ”مذاق کر رہی تھی۔“

”تو مومانی۔ میری پوری زندگی آپ کے مذاق کی نذر ہوگی اب؟ نہیں۔ اب نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کس لیے مجھ سے کئی کترارہی ہیں۔ میں بن ماں باپ کی غریب لڑکی ہوں۔ میرے پاس کوئی جینز نہیں۔ کوئی سرمایہ نہیں۔ گھر نہیں۔ میں فقیر ہو چکی ہوں۔ کوئی کیا دیکھ کر پسند کرے گا۔ میرا تو آپ نے مذاق ہی بنا رکھا

تھا۔ ماموں نے بھی اپنے رشتے کا خیال نہیں کیا۔ تو میں کیوں کسی کا خیال کروں۔“

وہ اب اندر کمرے میں آگیا تھا۔ انگلیاں مسلتا ہوا۔ ہائے جیسے کہیں کا شہزادہ مگر کبھی شہزادہ تو دیکھا نہ تھا۔ اچھا ہیرو سہی۔

”آپ نے ادھر ثریا باجی کی شادی پر میرے سلام کا جواب دے کر منہ پھیر لیا۔ بات ہی نہیں کی۔ ماموں نے بھی ملنا چھوڑ دیا۔ میں اتنی کم تر یہ غیر اہم بھی آپ کے لیے۔ بار بار یہی سنتی رہی۔ وہ نہیں مانتا اب کیا مجھ میں سرخاب کے پر اگ آئے ہیں۔“ (اگتے ہیں کہ لگتے ہیں۔ پتا نہیں خالہ بی نے کیا کہا تھا۔ اف) سعیدہ مومانی پھر لیٹ گئیں۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہے میری جان اور ہمیں دولت جینزی کی ضرورت بھی نہیں۔ بس میری چاند۔ میرے گھر میں روشنی کر دے۔ آرزو ہے میری۔“

”لیکن۔۔۔ آپ نے پچھلے دنوں۔۔۔ امیر گھر سے بہو لانے کا بہت چرچا کیا۔ اپنی پوزیشن کے مطابق۔ آپ نے کہا۔ ہم فقیروں سے نانا جوڑ کر خاندان میں اپنی سبکی نہیں چاہتے۔ مومانی۔ اب کیا میں فقیر نہیں۔ امیر ہو گئی ہوں۔“ آواز بھرا گئی سچ بچ۔

”کس۔ کس۔ اور کس نے کہا جھوٹ بالکل۔ بلاؤ ذرا۔“ ہڑپٹا گئیں بوکھلا گئیں۔

”میری موجودگی میں کہا تھا۔ آپ نے کہا۔ میرا بیٹا لٹو پنجو لوگوں میں رشتہ کر کے ہنسی نہیں اڑوا سکتا۔ بس مومانی۔ آپ جا میں۔ خالہ بی سے بات کریں۔“ منہ موڑ لیا۔

ادھر ماں بیٹا جچ جچ کرنے لگے۔ ”می! میں نے یہ کب کہا۔ ہاں بچپن کے رشتے سے اختلاف تھا۔ آپ نے کوئی تصویر بھی نہیں بھیجی۔ یہاں بھی تصویر نہیں دکھائی۔ مجھے ملنے ہی لے جائیں۔ میں دیکھ۔“ بند لال ہونٹ خون کیو تر۔

”تو مجھے الہام ہوا تھا کیا کہ تصویر دیکھ کر تم راضی ہو جاؤ گے۔“

دروازے میں اجیہ کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ ”خالہ

بی آگئی ہیں مومانی۔“

سعیدہ مومانی ہڑپٹا کر اٹھیں۔ گھبرائی ہوئی۔ دروازے کے بالکل قریب جا کر لڑکھڑائیں۔ بیٹے کو ہٹانے کی کوشش میں خود پہلے نکلنے کی تگ و دو کی مگر دھڑام سے گر گئیں۔ بیٹا انہو کہہ کر انہیں اٹھانے کے لیے جھکا مگر۔ خالہ بی پجوشن سے بے خبر دروازے کو دھکا مارتی اندر تیزی میں گھسیں تو سعیدہ مومانی کے سر سے ان کا پیر ٹکرایا۔ سنبھلنے کی کوشش میں۔ خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے ہاتھ کسی ان دیکھے سہارے کی طرف پھیلائے۔ تو جو چیز ان کی ہتھیلی سے ٹکرائی۔ وہ لڑکے کے لمبے بال تھے۔ گرنے سے تونج گئیں۔ بال انہوں نے منٹھی میں جکڑ لیے۔

ادھر لڑکا بے چارہ اس ناگہانی افتاد پر سر اٹھانے پر مجبور کہ بال۔ کسی کی منٹھی میں تھے بھاری بدن کی سعیدہ مومانی خود اٹھنے سے قاصر۔ بیٹا اٹھانا چاہتا تھا وہ بھی آزمائش بن گیا اس لیے۔ اب نہ اماں بیٹے کے ہاتھ چھوڑ رہی ہیں نہ خالہ بی اس کے بال۔ خالہ بی کی ٹھوکر جو سر پر لگی اس نے چیخیں نکال دیں۔ ”معہذ مجھے اٹھا۔“ کہہ کر پھر سے لیٹ گئیں۔ نہ وہ اٹھتی ہیں نہ بیٹا اٹھا سکتا ہے کہ بال جڑ چھوڑنے کے قریب تھے۔ ادھر اجیہ اندر آکر حیران۔ پھر دونوں لڑکیاں ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال پلنگ پر لوٹیں لگا رہی ہیں۔

وہ تو رفیعہ حالات حاضرہ کا جائزہ لینے اندر آئیں تو انہیں اس عجیب اور انوکھے جنگ و جدال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سمجھنے کا موقع نہ تھا۔ انہوں نے پہلے ذرا سی جھکی ہوئی خالہ بی کو پکڑ کر کھڑا کیا۔ خالہ بی نے بال چھوڑ دیے۔ لڑکے نے یک لخت اماں کے ہاتھ چھوڑ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اوووف۔ اب رفیعہ سعیدہ کو اٹھانے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ کھڑی ہوئیں۔ تو سعیدہ بے چاری نے چوٹ کو بھلا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

خالہ بی نے بھی ازراہ مصلحت ہاتھ بڑھایا۔ (ارادہ لڑائی کا بھول کر) اب ہاتھ دونوں کے ملے۔ پھر سعیدہ

ہے تو یہاں درجن بھر امیدوار موجود، مگر مہربانو، شہربانو کی معافی خوشامد۔

خالہ بی کے دل نے پیچنا شروع کر دیا۔ اب مہمانوں کی فہرست۔ شادی ہال کی بکنگ، مگر سب سے پہلے خالہ بی کی فرمائش اور مشورہ۔

”دیکھو بی سعادہ! سچ تو یہ ہے کہ نہ مجھے نہ اصباح کو سنجے لوگ پسند اور تمہارا بیٹا۔ بہت جلد گنجا ہو جائے گا۔ اس لیے پہلے تم سرسوں کا اصل تیل منگالو۔ اس میں کلو بچی میتھی فلاں فلاں پکا کر مالش کرو۔ روزانہ۔ مجھے بھیجنا تیل۔ میں بنا دوں گی۔“

اور اندر کمرے میں نوجوان جوڑا۔ اب مسکرا رہا تھا۔ اصباح شرمائی اور لڑکا دو سو بیس جان سے عاشق ہو گیا۔ لڑکے کے بال بے ترتیب ہو گئے تھے۔ اصباح کا جوڑا بھی کھل کر کمر گردن پر بکھر گیا تھا۔

”تم۔ میری ہو۔ ازل سے۔“ لڑکے نے جھجک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اصباح نے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ ہکلا گئی۔ ”تو۔ میں نے کب انکار کیا؟“ اور ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگی۔ باہر بڑی خوش گوار دوپہر چھائی ہوئی تھی۔ دھوپ اور سائے ملن رت کے گیت گارہے تھے۔

خالہ بی اور سعیدہ مومانی مہمانوں کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ کھانوں کی اقسام مہربانو شہربانو طے کر رہی تھیں۔ اصباح بھاگتے بھاگتے اجیہ سے لپٹ گئی۔ دونوں پر از سر نو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

ساری عمر غم کے دریا میں غوطے لگانے والی اصباح۔ ہنسی کو ترستی رہی۔ آج اپنے ہی قہقہوں سے حیران ہو رہی تھی۔ شاد کام ہو رہی تھی۔

زندگی کے امتحان کا رزلٹ تو بہت شاندار آیا تھا۔ میں تمہاری ہوں۔ بچپن سے۔ دل نے لہک کر کہا تھا۔

نے ایک چیخ ماری۔ ساتھ ہی خالہ بی نے ایک ساتھ تین چیخیں۔ دولہا میاں (متوقع) کے بالوں کا گچھا جو بذریعہ خالہ بی کی ہتھیلی کے سعیدہ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ انہوں نے ”ہائے اللہ یہ کیا ہے؟“ کہہ کر ہاتھ جھٹکا۔ خالہ بی نے سعیدہ کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ جھٹکا۔ سعیدہ ڈر گئیں۔ یہ نرم سی جان دار جیسے مکڑی کا جالا جیسی چیز کو ہتھیلی سے چھڑانے کی کوشش میں دونوں خواتین ایک دوسرے سے بازی لے جا رہی تھیں ان کی یہ کاوش بے چاری رفیعہ نے بھگتی جوان کے درمیان آگئی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں چپکے ہوئے پال رفیعہ کے منہ پر چپک گئے۔ وہ آخ۔ آخ کرتی ہاتھوں سے اس دن دیکھی چیز کو چرے سے ہٹاتی باہر لپک گئیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مکڑی کا جالا آکھال سے کیا۔ منہ پر چپکنے کے لیے۔

کمرے میں لڑکیوں کو لوٹن کو تر بنا دیکھ کر خالہ بی کو بھی ہنسی آگئی۔ شرماء شری سعیدہ بھی ہنسنے لگیں۔ لڑکا یعنی دولہا (متوقع) سر سے ہاتھ ہٹا کر بال جھٹکنے کے فعل سے فارغ ہوا تو سب کو زعفران کے کھیت میں موجود پا کر گھورنے لگا۔ جڑیں کافی دکھ رہی تھیں۔ بالوں کی۔ اذیت اب بہت بڑھی تو کھلکھلا ہٹ نے زور پکڑا۔

اجیہ ہنستے ہنستے نیچے جا گری۔ ساتھ ہی اصباح کو گھسیٹ لیا۔ پیٹ پکڑے ہنستی چلی گئیں۔ پھر دونوں اٹھ کر باہر بھاگیں تو ٹکرا گئیں دولہا میاں سے۔ اور دولہا موقع کو ضائع کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اجیہ پہلے نکلی۔ دولہا نے اصباح کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اصباح کھڑی رہ گئی۔ حیران یہ ”نرم ہاتھوں کی حرارت۔ ملائمت۔ گداز۔ مضبوط گرفت زبان حال سے کچھ بیان کر رہی تھی، مگر مٹی جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ جیسے انہیں اپنی آغوش میں سموئے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ حالات حاضر سے بے خبر۔ خالہ بی سعیدہ کو ساتھ لے کر چلی گئی تھیں۔ اور۔ اصباح کے متوقع کئی رشتے گنوانے کے بعد۔ یعنی اگر سعیدہ کی طرف سے انکار

